کالا شہر گورے لوگ

(ناول)

احسان الحق

ناولستان۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

تقسیم کار

مسدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخ دلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار۔ دلی ۶

شاخ بمبئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

مارچ ۱۹۷۰ء

(جمال پرنٹنگ پریس، دلی)

قیمت پانچ روپے

ماضی حال اور مستقبل

"کالا شہر گورے لوگ" کی پہلی قسط جب ۲۰ر فروری ۱۹۶۵ء کو ظ انصاری کے "آئینہ" میں شایع ہوئی تو پڑھنے والوں کے خطوط کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان خطوں میں گالیاں بھی ہوتی تھیں اور تعریفیں بھی۔ زیادہ خطوط ایسے تھے جن سے لکھنے کا حوصلہ بڑھتا تھا۔ ظ انصاری نے اصرار کیا "اور لکھو۔ اور لکھو"۔ کوئی چار قسطیں اور چھپی ہوں گی کہ احسان الحق کو غم دوراں لگ گیا اور وہ قلم رکھ کر روزگار میں پھنس گئے۔ جب یہ بیماری دور ہوئی تو غم جاناں کے حملے شروع ہوگئے۔ پھر جب آنکھ کھلی تو شادی ہوچکی تھی۔ ایک نشہ کا عالم تھا اور ایسے میں بھی قلم اٹھانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر خدا خدا کرکے جب ازدواجی زندگی عادت بن گئی تو ناول پیدا ہوگیا۔

احسان الحق نے لندن میں تقریباً سات سال گزارے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ناول کو پیدا ہونے میں بھی تقریباً سات سال لگے ہیں۔ "کالا شہر گورے لوگ" کے پیچھے ایک ماضی کا گہرا شعور ہونے کی وجہ سے لندن کی زندگی کے عجیب و غریب

پہلو سامنے آتے ہیں۔ عام طور پر ہمارے لیکھک، سیاحوں کی طرح لندن جاتے ہیں اور پھر ادیبوں کی طرح وہاں کی زندگی پر افسانے لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اس ناول کو پڑھ کر آپ کو ایک نیا تجربہ ہوگا۔ اس کا ہر جملہ اچھوتا ہے اور اس کی ہر بات ایک نیا پن لیے ہوئے ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اردو ادب میں اپنی قسم کا پہلا ناول ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہم نے اس ناول کو چھاپنے کا فیصلہ اسی لیے کیا ہے کہ یہ آج کا ناول ہے مستقبل کا ناول ہے۔ گزشتہ کل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو غصہ بھی آئے گا۔ گالیاں بھی دیں گے۔ پریشان بھی ہوں گے لیکن ساتھ ساتھ آپ کو ایک پورے ملک ایک پورے ساج ایک پوری نسل اور ایک پوری تہذیب کا تجربہ بھی ہوجائے گا۔

ناول کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے "کیا واقعی یہ سب کچھ لندن میں ہوتا ہے؟"

تو اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے دور نہیں جانا ہوگا۔ "کالا شہر گورے لوگ" کے کریکٹر اس کا جواب دیں گے۔ ناول کے دو مکالمے آپ کے سامنے ہیں۔ پہلا مشرق کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسرا مغرب کی مکمل تصویر ہے۔

پہلا تو یہ ہے " ہم دونوں عشق کی اس منزل پر جسمانی سہارے کے بغیر پہنچے تھے۔ یہ لب آج بھی تشنہ ہیں اُس وقت بھی تشنہ تھے۔ یہ اس آفتِ جاں کے ہونٹوں تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ محبت کی مہر ثبت کرنے کے لیے صرف ہونٹوں کا ملاپ

کافی نہیں ہے۔"

اور دوسرا ہے "یورپین سماج کی یہ خرابی ہے کہ یہاں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو کم عمری ہی میں جنسی تجربے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں کی ۸۰ فی صدی عورتوں کی شادی اس وقت ہوتی ہے جب وہ حاملہ ہو چکی ہوتی ہیں۔"

تو آپ نے تضاد دیکھ لیا۔ بس حقیقت بھی یہی ہے۔

'کالا شہر گورے لوگ' ایک بین الاقوامی ناول ہے۔ جس کا میدان عمل ملکی سرحدوں' مذہبی دیواروں اور رنگ و نسل کی تفریق سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ شاید اسی لیے ناول میں جگہ جگہ قوس و قزح کے رنگ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس میں ایک بڈھا قدامت پسند انگریز ہے جو یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کا داماد کالا ہوگا۔ لیکن جب وقت اسے سبق سکھاتا ہے تو کرشن کا بت اپنی جسامت سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے اور پھر یہی بڈھا قدامت پسند انگریز ایک کالے بچے کی خاطر کرائسٹ کو للکارتا ہے "اگر اب کی تو نے میری نہ سنی تو میں تجھے بھی چھوڑ دوں گا۔"

اس میں ایک نوجوان مولانا شراب کے نشے میں یہی چلاتا رہتا ہے "خدا کی قسم یہ شرافت کا لیبل میرا نہیں ہے۔ میرے خاندان کا ہے۔ خدا کی قسم یہ داڑھی میری نہیں میرے باپ کی ہے۔" پھر وہ اپنے ذہنی اور جنسی انتشار میں خدا سے صرف ایک شکایت کرتا ہے "اے خدا تیری عبادت کے بل بہت دیر میں ادا ہوتے ہیں۔"

اس کا ہیرو گوتم بدھ کے فلسفے کا سہارا لے کر اپنی محبوبہ کے ہونٹوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔
اس کی بدھی حاملہ ہیروئن گرجا گھروں میں جاکر شب و روز گڑگڑا گڑگڑا کر صرف ایک ہی دعا مانگتی ہے "یا خدا تو مجھے کالا بچہ دے۔"
اور اس کا سب سے بڑا ناسٹک ہیرو آنند "اتنا خوبصورت ہے جتنا کتابوں میں مذہب ہوتا ہے۔"
ہمارا خیال ہے کہ لندن میں رہنے والے ہندوستانی طالب علموں کی زندگی، ان کے مسائل، ان کی پریشانیوں، ان کی بے راہ روی اور دو تہذیبوں کے ٹکراؤ پر اس سے اچھا ناول ابھی تک نہیں لکھا گیا ہے۔
آخر میں ادارہ آپ سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہے۔ اشاعت کا یہ نیا سلسلہ ہم نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ہم وقت کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی اور حال کا تضاد روز بروز گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور اب تغافل محبوب کی ادا کا نہیں خودکشی کا نام ہے۔

(ادارہ)

رقصِ ناتمام

خالد کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے قدم اپنی جگہ سے ہل دیکتے تھے۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ عورت کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سرد پڑ گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ نسوانی جسم کی اسی خوشبو کے بارے میں اس نے کیا کچھ سُنا تھا اور کتنا پڑھا تھا۔ مگر یہ تو اس سے بھی زیادہ کہیں زیادہ تیز نکلی۔

ڈانس ٹیچر نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں خالد کی انگلیوں میں الجھا دیں۔ اور بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے سمجھانے لگی کہ اپنا ہاتھ میری کمر کے گرد ڈال دو۔ اور پھر quick quick slow پر قدم اٹھاؤ۔ لیکن خالد کے قدم تو آسمانوں پر تھے زمین پر تھے ہی نہیں۔ اب ذہن بے لگام گھوڑے کی طرح بہک رہا تھا۔

"ایسی کی تیسی میں گیا رقص" کمر پر پڑے ہوئے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔ اور وہ اُس کے اتنے قریب آ گئی کہ خالد نے اس کے سینے کے لمس اور گداز کو محسوس کیا۔ اس کی سانسوں سے آگ برسنے لگی اور قدم ڈگمگانے لگے۔ ٹیچر، خالد کی اس کیفیت سے بے خبر فرش

پر اس کے قدموں کو دیکھ کر Quick Quick Slow کی گردان دہراتی رہی۔ اور جب اس نے خالد کے بے تکے اٹھتے ہوئے قدم دیکھے تو وہ بڑے پیار سے مسکرائی اور کہنے لگی

"آج تمہارا پہلا دن ہے نا"

"جی۔ جی ہاں" خالد ہکلایا

"اپنے پارٹنر کو اتنی زور سے کبھی مت پکڑو۔ ورنہ وہ آزادی سے رقص نہ کر سکے گی" ٹیچر کے لہجے میں بے تعلقی تھی۔

خالد کا جی چاہا کہ وہ چلا کر کہہ دے۔ "مجھے رقص نہیں چاہیے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں دونوں ہاتھوں کو تمہاری کمر کے گرد جکڑ کر اس زور سے بھینچنا چاہتا ہوں کہ تمہارا جسم مجھ میں سما جائے" لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کے چہرے پر کھسیاہٹ نے سرخی دوڑا دی۔

"مجھے گرمی بہت لگ رہی ہے"

"تعجب ہے۔ شام کے اخبار میں تو لکھا تھا کہ آج کی جیسی سردی پچھلے پچیس سال میں نہیں پڑی ہے" ٹیچر مسکرا رہی تھی۔

"تو۔ تو پھر میری طبیعت خراب ہو گی" خالد نروس تھا۔

"جی نہ چاہتا ہو تو ڈانس نہ کرو۔ کل آ جانا" ٹیچر نے نرمی سے کہا

"ایسی بات نہیں ہے۔ ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ میں۔ میں تو آپ کے ساتھ صبح سے شام تک رقص کر سکتا ہوں" خالد کہنا چاہتا تھا کہ زندگی بھر رقص کر سکتا ہوں۔

موسیقی کی دھن بدلی۔ تو ٹیچر ایک لمحے کے لئے رکی اور خالد سے کہنے لگی "کیا خیال ہے ہم لوگ کن سے شروع کریں"

"ہاں۔ ہاں میں کل اسی وقت آجاؤں گا۔ لیکن ایک بات ہے۔ کل آپ ہی میری ٹیچر ہوں گی نا؟"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ یہاں چھ لڑکیاں ڈانس سکھاتی ہیں اگر آپ مجھ ہی سے سیکھنا چاہتے ہیں تو منیجر سے کہہ دیجیے گا۔ اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

ٹیچر نے خالد کی کمر سے ہاتھ نکال لیا۔ اور خالد کو ایسا لگا جیسے ہوا میں اڑتے ہوئے پیراشوٹ کی چھتری اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ لیکن اس نے ہمت کر کے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"سنیے! آپ کا نام کیا ہے۔ یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔"

"مارگریٹ" اُس نے اختصار سے کام لیا۔

"اور مجھے خالد کہتے ہیں۔" وہ مارگریٹ سے ہاتھ ملا کر جب باہر نکلا تو لندن کے آسمان سے کہرا اور زمین سے عمارتیں کچھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف لپک رہی تھیں کہ ان کی حدوں کا تعین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ رنگوں کو ترسی ہوئی لندن کی کالی عمارتوں پر بے چارگی برس رہی تھی۔ جیسے جیسے دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ بجلی کے کھمبوں نے اپنی روشنی سمیٹنا شروع کر دی تھی۔ اور اب وہ اپنے قد سے دوگنے اونچے ہو کر ٹمٹما رہے تھے۔

زندگی کے اس نئے تجربے نے اُسے وقت جگہ موسم اور فرائض سے بے نیاز کر کے ایک نئی زندگی دے دی تھی۔ وہ رات بھر سو نہ سکا۔ اور دوسرے دن اس نے غلطی یہ کی کہ فیکٹری کا کام کرنے کے لیے بھی نہیں گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت پہاڑ بن گیا۔ جیسے کاٹنے کے لیے

اس کے پاس صرف مارگریٹ کا تصور اور آئندہ کے خدشے تھے۔

دن بھر اس نے داڑھی نہیں بنائی۔ اس نے سوچا مجھے چھ بجے ڈانس کے دوسرے سبق کے لیے جانا ہے۔ اس لیے پانچ بجے داڑھی بنانا مناسب رہے گا۔

شام کو چھ بجے جب دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ڈانس ہال میں قدم رکھا تو مارگریٹ کی کمر میں کسی دوسرے طالب علم کا ہاتھ پڑا ہوا تھا۔ اور وہ اسی انہماک سے اُسے ڈانس سکھا رہی تھی۔ خالد پر ایک بجلی گری اس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا سا لگا۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے کو سنبھال لیا۔ یہ خدشے راستے میں آئیں تھے ان پر تو وہ ساری رات سوچ بچار کر چکا تھا۔ وہ اداس ہونے لگا تھا۔ لیکن مارگریٹ کی نظر جیسے ہی خالد پر پڑی وہ مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آگئی۔

"خالد آج کیسی طبیعت ہے"

"کل سے اچھی ہے" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کل طبیعت خراب ہونے کے باوجود تمہاری گرفت بڑی سخت تھی" مارگریٹ نے چوٹ کی۔

"لیکن آج میں آپ کو گلاب کے پھول کی طرح سنبھال کر رکھوں گا"

دونوں ہنس دیے۔ مارگریٹ خالد کو فلور پر لے آئی۔ ہاتھ ہاتھ سے ملے۔ خالد نے ایک لمحے کے لیے مارگریٹ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور مارگریٹ فوراً بول اٹھی "QUICK QUICK SLOW یاد ہے"

"ہاں یاد ہے۔ سب اچھی طرح یاد ہے۔ دونوں بڑی دیر تک

رقص کرتے رہے۔ موسیقی کی دھن ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی ۔ مارگریٹ کا کئی دفعہ جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ بہہ جائے۔ اڑ جائے۔ لیکن خالد کے اناڑی قدم اُسے روکے رہے۔ پھر خالد کہنے لگا۔

"ہمارے یہاں جب اُستاد پہلا سبق دیتا ہے تو اسے مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔"

"اتنی اچھی رسم کو تم نے کیوں چھوڑ دیا ہے۔" مارگریٹ شرارت سے بولی۔

"مارگریٹ ذرا ایک منٹ۔"

جس وقت خالد نے اپنی جیب سے وہ چھوٹا سا پیکٹ نکالا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا اور دن بھر کا رٹا ہوا جملہ اس کی حلق میں پھنس رہا تھا۔

"مارگریٹ یہ چاندی کی بالیاں ہیں تمہارے لیے لایا ہوں۔ یہ تحفہ میں نے ہندوستان میں یہ سوچ کر خریدا تھا کہ لندن کی سب سے خوبصورت لڑکی کے کانوں میں پہناؤں گا۔ اور پھر سنہری بالوں کے پس منظر میں ان بالیوں کو جھولتا ہوا۔ لہراتا ہوا۔ ناچتا ہوا دیکھوں گا۔"

مارگریٹ کو یقین نہ آیا۔ لیکن بالیوں کو ہاتھ میں لے کر وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ چٹکی میں پکڑ کر وہ ان کو جھکولے دیتے ہوئے کہنے لگی "یہ تو بہت خوبصورت ہیں۔ یہ تو واقعی بہت شاندار لگتی ہیں۔ تم کتنے اچھے ہو۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ۔ اچھا آؤ اب ڈانس کریں۔ تم نے کل کا سبق یاد کر لیا ہے۔"

خالد نے تو کل کا سبق زندگی بھر یاد رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ

کہنے لگا۔ "آپ سنیچر کی شام میرے ساتھ کیوں نہ گزاریے ۔ ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

مارگریٹ کو خالد کی جسارت پر اچنبھا ہوا۔ لیکن اسے دعوت قبول کر لینے میں زندگی کا ایک اور تجربہ ہونے کی امید نظر آئی۔ اس لیے اس نے مسکرا کر پوچھا "کیا استاد کو مٹھائی کھلانے کا ارادہ ہے؟"

"مٹھائی نہیں کھاتا" خالد کی ہمت بڑھ چکی تھی۔

"کیا کھلاؤ گے؟"

"وہ جو آپ نے زندگی میں کبھی نہ کھایا ہو۔"

"میں نے زہر کبھی نہیں کھایا ہے۔" مارگریٹ بڑی زور سے ہنسی۔

"آپ کیوں زہر کھائیں۔ زہر تو دوسرے آپ کی خاطر کھائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے دن ہوگا سنیچر کا اور وقت ہوگا شام کا۔"

مارگریٹ نے خالد کے دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

خالد کے ہوش و حواس نہ صرف لوٹ آئے تھے بلکہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ لپک کر گانے لگے۔ وہ مسکراتے ہوئے شوخی سے کہنے لگا "نہیں دن ہوگا عید کا اور وقت ہوگا لگن کا۔"

خالد جب گھر لوٹا تو اس پر ایک عجیب سناٹے کی کیفیت طاری تھی۔ آج وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی لندن کی زندگی تو بہت مختصر تھی۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اور ابھی تو اسے تجربوں کی جانے کتنی اور منزلوں سے گزرنا تھا۔

لندن میں وہ بغیر پیسے کے داخل ہوا تھا۔ گزرے ہوئے دن اس کی زندگی کے جانے کتنے برسوں پر حاوی تھے۔ اگر اسے آنند اور برکی کا سہارا نہ مل گیا ہوتا تو شاید وہ اپنی شکست کو کوئی سیاسی یا نسلی رنگ دے کر واپسی کا ٹکٹ لے چکا ہوتا۔

آنند، لندن کے ان تجربہ کار ہندوستانیوں میں سے ایک ہے۔ جو قانون کے دائرے کو کبھی پار نہیں کرتے۔ لندن میں لندن کے رہنے والوں کی طرح رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن پر اڈلی، ڈوسا یا سرسوں کا ساگ کھانے کے دورے نہیں پڑتے۔ اور شاید یہی وجہ تھی جو اس کے حلقے میں ہر ملک ہر مذہب ہر نسل اور ہر رنگ کے لوگ شامل ہو جاتے تھے۔

خالد نے آنند کی تلاش اس وقت شروع کی تھی جب نوکری کی ضرورت تشویشناک حد تک پہنچ چکی تھی۔

کالے لوگوں کے لئے سفید کالر کی نوکری کچھ عجیب سا لگتا ہے انگریزوں کو۔ اسی لیے ہر دفتر میں خالد سے یہی کہا گیا کہ آپ اپنا پتا چھوڑ جائیے ہم جلد ہی کوئی انتظام کر دیں گے۔ دکانوں کے کاؤنٹر پر بھی وہ دھ

لی کانی کے رنگ کے لوگ سمجھتے نہیں اس لیے وہاں کام ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ خالد نے فیکٹریوں کا رخ کیا تو پتا چلا کہ تقریباً تمام جگہوں پر اس کے پہنچنے سے صرف پندرہ منٹ پہلے کسی کا تقرر ہو چکا ہے۔

اب خالد کا آخری سہارا تبس آنند تھا۔ جو پچھلے آٹھ برسوں سے لندن میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ماں باپ نے بیٹے کو بڑے چاؤ اور ارمانوں سے لندن بھیجا تھا لیکن بیٹا بیچ راستے میں بھٹک گیا۔ پھر اتنے بہت سے موڑ آگئے، کہ اصلی راستے کا پتا نہ چل سکا۔

لندن میں وہ بی بی سی کے سہارے روزی کمانے کے علاوہ بہت سے اہم سوشل کام انجام دے رہا تھا۔ اس نے ہندوستان سے آنے والے نئے طالب علموں کو امتحان پاس کرنے اور گھر سے روپے منگائے بغیر تعلیم حاصل کرنے کے گر بتانے کا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

آنند کی شخصیت میں بڑا جذب تھا۔ خالد پر بھی اس کی شخصیت نے اپنی چھاپ لگا دی۔ کیوں کہ وہ اپنی باتوں سے جہاں دیدہ اور پُرخلوص آدمی معلوم ہوتا تھا۔ خالد جب اس سے ملا تو وہ فوراً ہدایات دینے پر اتر آیا۔

• سب سے پہلی بات تو یہ کہ آپ ایک کالا سوٹ خرید لیجیے جس کے لیے آپ کے پاس پاؤنڈ نہ ہوں گے ۔ میں اُدھار دیدوں گا۔ اور یہ جو ڈھیلے ڈھالے کپڑے آپ نے پہن رکھے ہیں ان کو تہہ کر کے سلیقے سے بکس میں رکھ دیجیے اگر چار چھ مہینے کے بعد پہننے کو جی

چاہیے تو آپ نکال لیجیے گا۔ ورنہ اپنے ساتھ ہندوستان واپس لیتے جائیے گا۔"

"دوسری بات یہ کہ بے کار قسم کے دبو پن کو بھول جائیے اگر ایک جگہ نوکری نہیں ملتی تو دوسری جگہ کوشش کیجیے۔ کسی کے انکار سے آپ کی عزت نہیں جانا چاہیے۔ آپ لاکھ پڑھے لکھے کیوں نہ ہوں اچھی نوکری بہر حال آئیڈیل محبوبہ کی طرح ہوتی ہے جو کبھی نہیں ملتی آپ جب اپنی فصیح انگریزی شروع کریں گے تو سامنے والا انگریز صرف ایک بات کہے گا۔ اور آپ جانتے ہیں وہ کیا بات کہے گا؟"

خالد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"موسیو وہ کہے گا- I BEG YOUR PARDON تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہوگا کہ شروع شروع میں آپ جو بل جائیے اسی پر اکتفا کر لیجیے۔

تیسری بات یہ کہ انگریز کا رعب بالکل نہ کھائیے۔ اسے برابر کا سمجھ کر تمیز سے بات کیجیے۔

اور چوتھی بات یہ کہ کہیں کسی موقع پر بے ایمانی کی یا جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کیجیے۔ کیوں کہ یہاں قانون کی گرفت سفارش سے ڈھیلی نہیں ہوتی۔

باقی رہا کام دلانے کا مسئلہ تو کل آپ آجائیے، میں نوکر رکھا دوں گا۔"

خالد نے آنند کی باتوں کو عقیدت میں ڈوبی ہوئی توجہ سے سنا۔ پھر کہنے لگا۔

"آنند میں صرف دس پاؤنڈ لے کر لندن پہنچا تھا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ اگر کسی فیکٹری میں مزدوری مل جائے تو کون کمبخت ہے جو قبول نہ کرلے "

آنند کا ایک زور دار قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔ خالد نے پریشان ہوکر وجہ پوچھی تو آنند کہنے لگا۔

" میں نے چھے سال فیکٹری میں مزدوری کی ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کو بھی اسی فیکٹری میں کام دلانے کا ارادہ ہے۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ نوکری حضور کی شایان شان ہوگی "

ایک مدت کے بعد خالد کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کہنے لگا "جہاں پناہ اس نوکری کو مقدر کا تحفہ سمجھ کر قبول کرلیں گے"

" قبلۂ عالم ۔ آپ کی یہ قربانی سلطنت برطانیہ شاید کبھی نہ بھول سکے "

دونوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ لیکن آواز ڈوبنے سے پہلے آنند بولا " اتنا مظلوم بننے کی ضرورت نہیں ہے "

" مظلومیت کی بات نہیں ہے آنند ۔ فیکٹری میں مزدوری کرکے میں گھر والوں کو کیا بیچوں گا " خالد نے تشویش کا اظہار کیا۔

" دیکھیے یہاں کے نوّے فی صدی ہندوستانیوں کی یہی پرابلم ہے۔ نوکری کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں لکھنا ہوگا۔ صرف نوکری ملنے کی خوش خبری اور تنخواہ کا حساب ۔ جب آپ کے والد بزرگوار کو خط ملے گا کہ صاحبزادے کو ایک ہزار روپے کی نوکری مل گئی ہے تو وہ آپ کا خط لے کر سارے محلے کا چکر لگائیں گے "

خالد کو آنند کی بات بالکل سچ لگی۔ اس کی نظروں کے سامنے بڈھے باپ کی تصویر آ گئی۔

لیکن آنند نے اسے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"انگریز ڈپلومیسی کا سمبل ہے۔ اس لیے گرے ہوئے کام کو اٹھانے کے لیے، یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ مزدور کے لیٹے ہوئے سر کو جھکانے کے لیے ایسے ویسے کاموں پر "DIGNITY OF LABOUR" کا لیبل لگا دیا ہے۔ چناں چہ اب اونچے لوگ اپنے کو اونچا سمجھتے ہیں اور نیچے لوگ اپنے کو نیچا نہیں سمجھتے۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔" خالد نے سوال کیا۔

"مطلب یہ DIGNITY OF LABOUR کا ہندی انوواد ہوتا ہے۔ "مجبوری بہر حال مجبوری ہے۔"

پھر جب خالد آنند سے رخصت ہونے لگا تو آنند نے چپکے سے پانچ پانچ پاؤنڈ کے تین نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیے تھے۔ اور خالد کے احتجاج کو بند کرنے کے لیے، اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

"شی ــــ ادھار ہیں۔"

خالد اس دن سچ مچ رو دیا تھا۔

●

اور اس طرح خالد ایک فیکٹری میں بھرتی ہو گیا۔ سنیچر کے دن جب ہفتے وار تنخواہ کا پہلا لفافہ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس میں دو سو روپے دیکھ کر وہ اپنے ملک کو یاد کرنے لگا۔ اُس کا

مزدور ساتھی خاموش کھڑا ہوا خالد کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اور خالد دنیا و مافیہا سے گم سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا! ۔۔ کہ ڈک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"میٹ آج تو تمھیں بیئر پلانا ہوگی"

"ارے آج تو میں تم کو بیئر میں نہلا دوں گا"

فیکٹری سے ملے ہوئے پب میں وہ دونوں کاؤنٹر کے پاس جا کر اسٹول پر بیٹھ گئے۔ ڈک نے دو پائنٹ 'ڈریل' کا آرڈر دیا۔ خالد نے تین روپے کا بل ادا کر کے جب جھاگ بہتے ہوئے مگ کو اٹھایا تو وہ اُسے بہت بڑا معلوم ہوا۔ ڈک کو گھر جانے کی جلدی تھی اُس نے چیرز کہہ کر ایک گھونٹ میں آدھا مگ خالی کر دیا۔ خالد نے جب گلاس منہ سے لگا کر چسکی لی تو اس کے ہونٹوں کے گرد جھاگ کا ایک ہالہ بن گیا۔ ڈک نے پہلے تو موسم پر بات کی۔ اس کے بعد کہنے لگا "ایک بات پوچھوں خالد"

"ہاں پوچھو"

دو لمبے گھونٹ لے کر ڈک کہنے لگا۔ "خالد تمھیں یہ ملک یہاں کے لوگ یہاں کا ماحول کیسا لگا"

ڈک کی نظریں خالد کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور خالد اس وقت اپنے دل سے یہ پوچھ رہا تھا کہ ہاں واقعی یہ ملک تمھیں کیسا لگا؟"

"بات در اصل یہ ہے ڈک کہ تمھارا ملک توقع کے بہت خلاف ہے۔ یہاں ہم آتے ہیں کچھ اور سوچ کر کچھ اور ذہنی تصویریں بنا کر۔

پچھلے کئی سو برس کی تاریخ ہمارے خیالات کا پس منظر ہوتی ہے لیکن جب ہماری ملاقات تم جیسے لوگوں سے ہوتی ہے تو سارے خیالات ایک جھٹکے سے اتھل پتھل دھڑام ہو جاتے ہیں۔"

ڈک اس وقت فلسفیانہ باتیں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُسے تو ساڑھے چھ بجے کی زمین دوز ٹرین سے جانا تھا۔ اس نے بات مختصر کرنا چاہی۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تم سے متفق ہوں" اور یہ کہتے ہوئے اس نے بار مین کو مزید دو پائنٹ بیئر کا آرڈر دے دیا۔ اس آرڈر کے پیسے خالد کے اصرار کے باوجود خود ڈک نے دیے اور کہنے لگا۔

"کل تم نے ٹیلی وژن کا پروگرام دیکھا تھا؟"

خالد نے گلاس منہ سے لگا کر ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور پھر ڈک کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا ایک سوال کر ڈالا۔

"ڈک اگر اخبار اور ٹیلی وژن تمہاری زندگی سے نکال دیے جائیں تو تم کیا باتیں کرو گے؟"

ڈک بہت زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"ہم موسم کی بات کریں گے۔"

دونوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔ ادھر ادھر بیٹھے ہوئے لوگوں نے گلاس سے نظریں ہٹا کر دونوں کو دیکھا اور پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ خالد کو فوراً خیال آیا کہ عام طور پر وہ اتنی زور سے تو نہیں ہنستا ہے۔ اس کا پہلا گلاس ختم ہو چکا تھا۔ سارے

بدن میں سنسنی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے دوسرے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ فاصلے کا اندازہ غلط ملا۔ انگلیاں گلاس سے ٹکرائیں اور بیئر چھلک کر کاؤنٹر پر بہنے لگی۔

خالد نے ایک دم محسوس کیا کہ اس پر بیئر کا اثر ہو چلا ہے۔ اور پھر اس نے ڈِک سے اصرار کیا کہ اس کا دوسرا گلاس بھی وہی پی لے، اس نے تھوڑے سے انکار کے بعد گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں گلاس خالی کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ اور پھر اختصار سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا۔

" اچھا بھائی۔ خدا حافظ۔ پھر ملیں گے "

ڈِک اسٹیشن کی طرف اس طرح بھاگ رہا تھا۔ جیسے گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ چکی ہے۔

●

کافی اندھیرا ہو چکا تھا جب خالد گھر پہنچا ہے۔ برنی اور خالد ایک ڈبل روم لے کر زندگی گزار رہے تھے۔ اور اس وقت خلاف معمول دیر سے آنے پر برنی خالد کا انتظار کر رہا تھا۔ خالد کی چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر برنی مسکرایا:

" تو آج سے تم لندن والے بن گئے۔ غالباً رش اور ختم ہونے کے انتظار میں پب میں بیٹھ گئے ہوگے "

خالد نے برنی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اس نے خاموشی سے جیب سے تنخواہ کا لفافہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور کہنے لگا۔

تمہیں بمبئی میں ایک منسٹر کی سفارش سے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی نوکری ڈیڑھ سال کے انتظار کے بعد ملی تھی۔ اور یہ لفافہ میری پانچ دن کی محنت کا معاوضہ ہے۔"

قیمے کی پلیٹ اور ڈبل روٹی کا بنڈل میز پر رکھتے ہوئے برنی کہنے لگا "ایک چیز کا دوسری چیز سے ایک آدمی کا دوسرے آدمی سے مقابلہ نہ کیا کرو ورنہ بہت دکھ اٹھانا پڑیں گے۔"

خالد نے برنی کے خلیل جبرانی جملے کو غور سے سنا اور پھر کہنے لگا۔

"اگر تم نے اپنی نصیحت پر خود ہی عمل کیا ہوتا تو شاید پاکستان سے بھاگ کر لندن آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

خالد اور برنی ہم عمر تھے۔ اور دونوں نے گرم انسانی خون سے ابھرتی ہوئی اُس ننھی سی، پتلی سی، حقیر سی لکیر کو دیکھا تھا جو بعد میں دو ملکوں کی سرحد بن گئی تھی۔ خالد اور برنی دونوں کو یونیورسٹی کی تعلیم تک زبردستی پنج وقتہ نمازیں پڑھائی گئی تھیں۔ اور ان دونوں کو تقسیم ہند کی خونی کہانی کا ذاتی تجربہ ہوا تھا۔

برنی کراچی میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ خدا بڑا اذیت پسند ہے۔ اور خالد نے بمبئی میں خدا اور بھگوان کی دشمنی پر غور کیا تھا۔ اور اسے خدا اور بھگوان دونوں ہی بڑے تنگ نظر اور چھوٹے چھوٹے سے دکھائی دیے تھے۔ یہ کیا بات ہے کہ جب آدمی آہستہ آہستہ پختگی کی عمر پر پہنچتا ہے اور ناہموار زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو اوپر والا پیچھے سے اسے اپنے پاس

بلا لیتا ہے۔

کراچی میں برنی کے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا تھا۔

"آدمیوں کے مقابلے میں موٹریں بہت کم ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ موٹر چلانے والے سب لوگوں کے لیے ایک اصول ہوتا ہے ایک کوڈ ہوتا ہے اور انسانوں کے اس الجھے ہوئے انبوہ کے راستہ چلنے کا کوئی ایک اصول نہیں ہے۔ سب کے اپنے اپنے اصول ہیں"

پنج وقتہ نمازیں پڑھتے پڑھتے ایک دن خالد کو ایک دم اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ترسی ہوئی جوانی کو جانماز کے نیچے نہیں دبایا جا سکتا"

اور اس طرح خیالات اور حالات نے ساز باز کر کے خالد کو بمبئی سے اور برنی کو کراچی سے لندن پہنچا دیا تھا۔

لندن میں ان کی مفلسی کا زمانہ تھا۔ اور دونوں کی گزر دودھ مکھن آلو اور قیمے پر ہو رہی تھی۔ اور ابھی تک ان دونوں کا شمار ان کرایہ داروں میں تھا جن سے مکان کی مالکہ بہت خوش رہتی ہے۔ سنیچر اور اتوار کی چھٹی دونوں کے لیے سوہان روح بن جاتی۔ کمرے میں صفائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر موسم خراب ہو اور دھند چھا گئی ہو تو دل اور بھاری ہو جاتا ہے۔ اس پر دو بجے دن سے اندھیرا اور مردنی پھیلا دیتا ہے۔ ایسے ہی روح فرسا ماحول میں ایک دن خالد نے کہا۔

"برنی ــــ ڈک روزانہ مجھ سے میری گرل فرینڈ کے بارے

میں پوچھتا رہتا ہے۔ اس سے یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ میں نے ساری زندگی میں صرف ایک عورت کا ہاتھ چھوا ہے۔ اور وہ عورت تھی میری ماں "!

برنی نے مشورہ دیا " یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے اپنی اخلاقی قدریں اتنی ہی اونچی ہیں "!

" لیکن میں تو جھوٹ بول دیا ہوں۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک جرمن لڑکی سے میری دوستی ہے۔ جو انتہائی خوبصورت ہونے کے علاوہ تجربہ کار بھی ہے۔ تو اب بتاؤ یہ کمی کہاں سے پوری کی جائے۔ اور لڑکی کہاں تلاش کی جائے " خالد واقعی جاننا چاہتا تھا۔

" لڑکی کہاں سے تلاش کی جائے!" برنی سوچ میں پڑ گیا " سوال بہت دلچسپ ہے "!

" سوال دلچسپ ہو یا نہ ہو، اہم بہت ہے " خالد نے وضاحت کی۔

" دیکھو خالد۔ آج تم نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے۔ جس کا جواب دینے کے لیے دو تین باتوں کی وضاحت کرنا ہوگی۔

میں پہلے اکیلا رہتا تھا۔ تمہاری حالت دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ کوئی ڈبل کمرہ لے کر تمہارے ساتھ رہا جائے۔

ساتھ رہنے میں اخراجات بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن دو لڑکوں کا ساتھ رہنا۔ یہاں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ٹھیک ہے "!

خالد " ہاں بالکل ٹھیک ہے "!

"ٹھیک ہے نہیں ٹھیک تھا۔ اب تم کو نوکری مل گئی ہے۔ اتنے پیسوں میں آدمی الگ رہ کر اپنے اخراجات برداشت کرسکتا ہے۔ اور جب لڑکی کی تلاش کی فکر ہو تو فوراً اکیلے رہنے کا بندوبست کرنا چاہیئے" برنی نے خالد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔ اور کل سے دو سنگل کمروں کی تلاش شروع ہو جائے گی" خالد نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ایک اپنے لیے اور دوسرا اپنی گرل فرینڈ کے لیے" برنی نے مذاق کیا۔

"ارے نہیں بھائی۔ ایک اپنے لئے اور دوسرا تمہارے لیے۔ اچھا خیر میرا اصل سوال ابھی تک جواب کے انتظار میں ہے"

برنی — "دراصل یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے"

خالد — "میرے مزاج سے تم واقف ہو"

برنی — واقفیت اس کو نہیں کہتے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے شادی کی پچیسویں سالگرہ پر اخباری نمائندوں کو جواب دیتے ہوئے ایک خاتون نے کہا تھا "میں اپنے شوہر کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی ہوں"

خالد "اچھا — بتاؤ۔ تم نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا تھا"

برنی "یہاں ایک اسکیچنگ کلب ہے۔ جہاں ممبروں کو اسکیچنگ کی مشق کرانے کے لیے ننگے ماڈل کا انتظام کیا جاتا ہے مجھے میری پریشانی نے آرٹسٹ بنا دیا۔ اور پھر میں باقاعدگی سے وہاں جاکر اسکیچنگ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی بھی وہاں

روزانہ آتی ہے۔ میں نے پہلے ایک دو دن تو صرف ہلو تک ملاقات
رکھی۔ اس کے بعد ہم لوگ ساتھ چائے پینے لگے۔ اور پھر ایک دن
میں نے اس سے کہا کہ کیوں نہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے
ماڈل بن جائیں ـــــ اور میرا تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔

خالد: "تو لڑکی تلاش کرنے کا یہ طریقہ ہے؟"

برلی: "لڑکی تلاش کرنے سے غالباً تمھاری مراد گرل فرینڈ تلاش کرنے سے ہے۔"

خالد: ہاں نیک نیتی سے گرل فرینڈ بنانے کا پوتر خیال۔"

برلی: خالد ہمارے یہاں لمبے لمبے فاصلوں سے، آنکھوں آنکھوں میں محبت ہوتی ہے۔ اس نظر میں ہزاروں فسانے ہوتے ہیں۔ جن کی نہ تو جڑ ہوتی ہے۔ نہ پودا نکلتا ہے اور نہ پھول کھلتے ہیں۔ اور پھر یہ فاصلے ان کی جنسی بھوک کو شہہ دے کر ان میں دیمک لگا دیتا ہے۔ یورپ میں رسم و راہ پیدا ہوتے ہی قربت کی منزل آ پہنچتی ہے۔ لیکن شادی کا تصور ذہن پر مسلط رہتا ہے۔ تو اگر واقعی تم گرل فرینڈ کی تلاش میں ہو تو یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔"

"تم اس کو مشکل کام نہیں سمجھتے" خالد اس طرح مخاطب ہوا کہ جیسے اُسے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

خالد "تو پہلا سبق عنایت ہو۔"

برنی : پہلا طریقہ یہ ہے Language Tuition Centre کے نمبر پہ جاؤ۔ وہاں یورپی ممالک کی بے شمار لڑکیاں انگریزی سیکھنے آتی ہیں۔ اور سب کا پرابلم وہی ہوتا ہے جو تمہارا ہے۔

خالد : تنہائی کا پرابلم

برنی : ہاں بالکل یہی پرابلم۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم یہاں کے کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھا کرو۔ اگر کوئی لڑکی اکیلی بیٹھی ہو تو تم بڑے سلیقے اور شرافت سے، اس سے اجازت لے سکتے ہو "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں"، اس کے بعد موسم سے گفتگو شروع کر کے ہندوستان کی رہبانیت پر آجاؤ۔

اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کیرن کے ڈانس ہال میں ایک گھنٹہ ڈانس سیکھنے کے پانچ شلنگ لگتے ہیں۔ تم ذرا ادھر توجہ دو۔ مراد بر آئے گی اور اگر گھڑی شبیہ ہوئی تو ملن ہو جائے گی"

اور برنی کا یہی تیسرا طریقہ تھا جس سے خالد کی مراد بر آئی تھی اور شبیہ گھڑی کی آہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

●

سنیچر کی شام بہت دیر سے آئی مگر آ گئی۔ ملن کا وقت جیسے جیسے قریب آتا جا رہا تھا۔ گھڑی اتنی ہی سست ہوتی جا رہی تھی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لپک کر گھڑی کی سوئیوں کو چکر گھنی دے دے۔

بیئر کی تین چار بوتلیں ، دھلے ہوئے صاف شفاف گلاس تلے ہوئے پاپڑ میز پر اس طرح سجے ہوئے تھے ۔ جیسے سارے سامان عیش جمع ہو گئے ہوں ، اور انتظار کے اس جان لیوا سناٹے میں جب دروازے کی گھنٹی بجی تو خالد کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر چھناکے سے ٹوٹنے کی بجائے قالین پر لڑھک گیا ۔ ایک جست میں خالد دروازہ کھولے با ادب با ملاحظہ کھڑا تھا ۔ اور دروازے کے باہر ۔۔ باہر تو قیامت آچکی تھی ۔ چاندی کی دو بالیاں اس طرح جھوم رہی تھیں جیسے ہپنوٹائیز کرنے کے لیے پہنی گئی ہوں ۔

"بڑی دیر کردی آپ نے " خالد نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" دیر کر دی ! ذرا گھڑی دیکھیے "

" آپ ٹھیک وقت پر آئی ہیں لیکن پچھلا آدھا گھنٹا آدھا سال بن کر میرے اوپر سے گذر گیا ہے " خالد نے جذباتی ہو کر کہا ۔لیکن مارگریٹ ہنستی ہوئی ۔ دروازے کے اندر آگئی ۔ خالد جب اپنے دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے مارگریٹ کو روکتے ہوئے کہا ۔

" سنیے ! مجھے ایک رسم ادا کرنا ہے "

مارگریٹ " کونسی رسم "

خالد : ہمارے یہاں یہ رسم اگر ادا نہ کی جائے تو بڑی بدشگونی سمجھی جاتی ہے ۔

مارگریٹ ہنستے ہوئے کہنے لگی " تو پھر دیر کیا ہے ؟ "

خالد نے بڑھ کر مارگریٹ کی کمر میں دونوں ہاتھ ڈال دیے پھر

کہنے لگا "ہمارے یہاں دروازے پر مہمان کو پیار کیا جاتا ہے!"
اور مارگریٹ کے جواب کا انتظار کیے بغیر خالد اپنا کام کر چکا تھا۔
مارگریٹ نے جب بیئر پینے سے انکار کیا تو ایک لمحے کے لئے خالد کو اپنے سارے منصوبے غلط ہوتے ہوئے نظر آئے۔ لیکن اپنی برسہا برس کی شرافت اور گھگھے پن کا لبادہ اتارنے کے لیے خود اس کا شراب پینا بہت ضروری تھا۔ ایک بڑا سا گلاس بھر کر اس نے غٹاغٹ حلق سے اتار لیا۔ پھر دو واقعے ایک ساتھ ہوئے۔ بیئر نیچے اتری۔ اور نشہ اوپر چڑھا۔
"مارگ تمھیں میری خاطر تھوڑی سی پینا ہوگی۔"
وہ لجاجت سے بولی "لیکن خالد میں بیئر نہیں پیتی ہوں۔"
خالد "اگر تم پیتی ہوتیں تو میں اپنی خاطر پینے پر زور کیوں دیتا۔"
مارگریٹ "لیکن خالد اگر میں بیئر پینے لگوں تو اتنی موٹی ہو جاؤنگی کہ ڈانس بھی نہ کر پاؤں گی۔ اور پھر میری نوکری بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"
خالد بڑی دلیری سے بولا "تمھیں نوکری سے کون نکال سکتا ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ لاؤ ڈارلنگ اپنا گلاس۔"
مارگریٹ نے مجبوراً اپنا گلاس خالد کی طرف بڑھا دیا اور خالد نے موقعہ ملتے ہی دو گلاس لبا لب بھر دیئے۔
بڑی دیر تک وہ شراب کی چسکیاں لیتی رہی۔ ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کرتی رہی۔ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں پر قہقہے لگاتی رہی۔ اس کے ہر قہقہے پر چاندی کی بالیاں اس طرح جھوم اٹھتیں کہ

خالد اپنی بات کہتے کہتے رک جاتا۔ اتنی مکمل تصویر اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھا اور مارگریٹ کے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھا کر مارگریٹ کی بالیوں سے ٹکرایا " اس کی آواز بھی دلکش ہے "

" خالد -- یہ بالیاں تجھ پر بہت اچھی لگتی ہیں " مارگریٹ خالد کو دیکھتے ہوئے بولی۔

خالد : " بالیاں اتنی خوبصورت نہیں تھیں "

مارگریٹ نے پھر ایک قہقہہ لگایا " تمہارا مطلب ہے کہ اب خوبصورت ہو گئی ہیں۔ چونکہ میں نے ان کو پہن لیا ہے "

خالد : " میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں یہ بالیاں اتنی خوبصورت نہیں تھیں "

مارگریٹ پھر ہنس دی۔ اس کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ خالد نے دو گلاس پھر بھرے اور مارگریٹ کو ہندوستان کے قصے سنانے لگا۔ ہلکی پھلکی باتوں سے جب وہ گوتم بدھ کے موضوع پر آیا تو اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

" مارگ جانتی ہو گوتم بدھ نے سب کچھ تج کر نروان حاصل کیا تھا۔ اور پھر مرتے وقت اس نے، دکھ سے چور آنندا سے کہا تھا۔ " انسان کو زندگی کی چار حقیقتوں کا علم ہونا چاہیئے " جانتی ہو وہ کونسی چار حقیقتیں ہیں "

مارگریٹ بڑی توجہ اور بڑی دلچسپی سے خالد کی باتیں

سن رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

خالد تھوڑی دیر کے لیے گوتم کے تصور میں کھو گیا۔ وہ دور خلاء میں دیکھ رہا تھا۔

نمبر ایک : انسان کا وجود دکھ سے بھرا ہوا ہے

نمبر دو : ہر دکھ کا ایک سبب ہوتا ہے۔

نمبر تین : ہر دکھ عارضی ہوتا ہے۔

اور نمبر چار: (خالد جملہ پورا کرنے سے پہلے مارگریٹ کے قریب آ گیا۔ اور قریب آیا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ مارگریٹ کی گردن میں حمائل کر دیے۔

اور نمبر چار : "ہر دکھ کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اس نے مارگریٹ کو اپنے اور قریب کر لیا) "مارگریٹ ہر دکھ کو، زندگی کے ہر غم کو دور کرنے کا طریقہ بھی ہوتا ہے"

مارگریٹ خالد کی قربت سے خائف نہیں ہوئی۔ وہ گڑیا کی طرح بیٹھی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو "جو چاہے کر لو"

مارگریٹ کے نرم و گرم ہونٹوں نے رسیلے پیار۔ اس کی لپ اسٹک کا پھیکا پن، اس کے سینے کی نرمی کو وہ کیسے بھول سکتا تھا "یہ ٹمن سے بجنے والے سینے ادیبوں کے ذہن کی پیداوار ہوں گے" اسے ایک لمحے کے لیے خیال آیا۔

جب خالد نے مارگریٹ کے ہونٹوں کو گنڈیری کی طرح چوس کر لمبی سانس لی، تو جانے کہاں سے اُسے یہ خیال آ گیا کہ مارگریٹ ایک اچھی بیوی بن سکتی ہے۔ اور یہ خیال آتے ہی۔ معاً مارگریٹ

کے چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ لے کر اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنے چہرے کو مارگریٹ کے اتنے قریب لے آیا کہ تاکیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

"تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تمھارے ساتھ پوری زندگی گزار سکتا ہوں۔"

مارگریٹ "تم جلدی کر رہے ہو خالد"

خالد "شادی کے لیے سب سے اہم کون سی چیز ہوتی ہے"

مارگریٹ: "زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا جائزہ لینا"

خالد: "صرف محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی کے لیے۔

مارگریٹ اگر محبت سچی ہو تو پھر کوئی کمی کوئی غلطی کوئی کمزوری کھائی نہیں دیتی"

مارگریٹ: "محبت کی اس منزل پر پہنچنے کے لیے آدمی کو خود پہنچا ہوا ہونا چاہیے"

خالد "مارگریٹ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

اس عجیب و غریب تجویز پر مارگریٹ حیران رہ گئی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ ناتجربہ کار لڑکا کس قدر تیزی سے منزلوں کو پھلانگ جاتا ہے۔ وہ اتنی حیران تھی کہ اسے اپنے ہونٹوں سے بہتے ہوئے خون کا بھی خیال نہیں آیا۔ خون دیکھ کر خالد پریشان ہو گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی قتل کر دیا ہو۔ اپنے ہاتھ سے وہ مارگریٹ کو تکلیف کیسے پہنچا سکتا ہے۔ رومال نکال کر اس نے مارگریٹ کے ہونٹوں کو صاف کر دیا۔ اور مارگریٹ کے شانے پر سر رکھ کر کہنے لگا "مارگریٹ مجھے معاف کر دو — مجھ

سے غلطی ہو گئی ہے "۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا، مارگریٹ کی گردن کا خم کس قدر خوبصورت تھا۔ اور ٹھوڑی کے اوپر، اس کے ترشے ہوئے ہونٹ، وہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ خون کا ایک اور نقطہ مارگریٹ کے ہونٹوں پر ابھر آیا۔ پھر یہ نقطہ بڑا ہوتا گیا۔ اب ایک قطرہ مارگریٹ کے ہونٹوں پر لرز رہا تھا۔ خالد کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے۔ جو ایک ایک کر کے مارگریٹ کے ادھ کھلے سینے پر ٹپکنے لگے۔ وہ خود حیرت سے اُن آنسوؤں کو سفید دادیوں کے بیچ پھسلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایسا عجیب و غریب تجربہ تھا یہ اس کی زندگی کا کہ بدحواسی میں خود اس کے آنسو تھم گئے۔

جانے کتنے گھنٹوں کے بعد گھڑی نے جانے کتنے بجائے ۔۔ مارگریٹ نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پرس کھول کر اس نے چھوٹے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ تھوڑے سے بال دبائے تھوڑے سے بال اٹھائے اور پھر واپس جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

وہ کچھ اس اعتماد سے جانے کے لئے کھڑی ہوئی تھی کہ جیسے فیصلہ بدلنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی ہو۔ اور خالد نے بھی خاموشی اور بے چارگی سے مارگریٹ کو اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "کیا تمہارے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی "؟

مارگریٹ کے جانے کے بعد خالد بڑی دیر تک آنکھیں بند کیے اپنی کرسی میں لیٹا رہا۔

●

دوسرے دن خالد نے اپنی آپ بیتی برنی کو سنائی۔ برنی کے

پرسکون چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ بہت اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔

"ویسے تو سب ٹھیک ہے لیکن جب لڑکیوں کو گھر پر بلاؤ تو مارٹینی کی انگوری شراب لے آیا کرو۔ بیئر لڑکیاں اس لیے پینا پسند نہیں کرتی ہیں کہ اس سے بار بار باتھ روم جانا پڑتا ہے۔"

برنی سے باتیں کرنے کے بعد خالد کو پتا چلا کہ گزشتہ رات خالد کا ہر مہرہ الٹا پڑا تھا۔ لیکن مارگریٹ نے کتنے صبر اور تحمل سے خالد کو جھیلا تھا۔ مارگریٹ جدائی کے وقت تک مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھی۔

لیکن مارگریٹ اس کے بعد خالد سے ملنے کبھی نہیں آئی۔ خالد کا یک طرفہ عشق تقریباً چھ مہینے تک جاں کنی کی کیفیت میں رہا۔ جب بھی تنہائی کا زہر ناقابل برداشت ہو جاتا تو وہ مارگریٹ کو فون کرتا۔ لیکن مارگریٹ کی شامیں خالد کے لیے کبھی خالی نہ ہوتیں۔

دن اسی طرح کٹتے رہے۔ فیکٹری کی نوکری عادت بن چکی تھی۔ سال میں صرف چار بینک ہالی ڈے ہوتی تھیں اور فیکٹری کے دوسرے مزدوروں کی طرح خالد کو بھی ان ہی کا انتظار رہتا۔ اس کے لہجے میں بھی کوکنی تلفظ سرایت کر گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو وہ بھی "میٹ" کہنے لگا تھا۔ تھینک یو' کی جگہ "ٹا" کافی تھا۔ اور کیپ آف ٹی' کے لیے اُس کے منہ سے بھی 'کپہ ٹی' نکلنے لگا تھا۔

لندن کی دکانیں [illegible]نا شروع ہو گئی تھیں۔ کرسمس میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے تھے۔ ریجنٹ اسٹریٹ پر لال پیلی روشنیوں کے طوق سجا دیے گئے تھے۔ روشنی کے بڑے بڑے ہار جڑاؤ زیور کی طرح دمک رہے تھے۔ اور لندن کے اخبار۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کرسمس کا ذکر کچھ اس طرح سے دن رات کرتے تھے کہ خالد لاشعوری طور پر کرسمس کی تیاری میں لگ گیا تھا۔

پہلا کرسمس

بڈھی ایلسی عام انگریزوں کی طرح سیدھی سادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا میں صرف دو قومیں بستی ہیں۔ جن میں ایک کا رنگ کالا ہے اور دوسری کا گورا۔ اس کے لیے انڈین۔ رڈ انڈین اور ویسٹ انڈین میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ان سب کو ایک ہی ملک کا رہنے والا سمجھتی تھی۔ ایلسی کا خیال تھا کہ دنیا کا ہر شخص کرسمس مناتا ہے۔ اسی لیے ایک دن فیکٹری میں ایلسی نے خالد سے پوچھا۔

"خالد تم کرسمس کہاں مناؤ گے۔

"یہیں لندن میں" خالد نے مختصر سا جواب دیا۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"یہاں سے ہزاروں میل دور ہندوستان میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میرے لیے انھوں نے تحفے خرید کر رکھے ہوں گے۔ اور ایلسی جب کرسمس کے دن میں لوگوں کو خوشیاں مناتے دیکھوں گا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے" خالد نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

ایلسی کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے اس نے یہ سوال پوچھ کر غلطی کی ہو۔ وہ خالد کے اور قریب آ گئی۔

"تمہاری باتیں سن کر دکھ ہوا۔ کیا لندن میں تمہارا کوئی نہیں ہے؟"

خالد کی آواز سے غم ٹپک رہا تھا۔ "نہیں یہاں میں کسی کو نہیں جانتا۔ میں نے سوچا ہے کہ کرسمس کے دن میں اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے سارا دن ریڈیو سنوں گا اور شام کو ٹیلی وژن سے جی بہلاؤں گا۔"

ایلسی کا غم اور بڑھ گیا۔ وہ کہنے لگی۔

"خالد تم بالکل تنہا ہو۔ کیسے دکھ کی بات ہے۔ لیکن گھبرانا نہیں کرائسٹ تمہارے ساتھ ہے۔"

"لیکن کرائسٹ کو جب سولی پر چڑھایا تھا تو اس کا کسی نے ساتھ نہیں دیا تھا۔"

ایلسی خالد کی بات کو سمجھ نہ سکی۔ وہ واقعی رنجیدہ تھی۔ خالد سے الگ ہو کر وہ سیدھی مسز وانٹن کے پاس چلی گئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ قصہ ساری فیکٹری میں پھیل گیا۔ مزدور مردوں اور مزدور عورتوں نے آ کر ہمدردی کی۔ وہ سب اس کے غم میں شریک تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک شخص ایسا نہ نکلا جو خالد سے کہتا۔

"تم میرے یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ میرے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔ ہم ساتھ مل کر ناچیں گے ہم ساتھ مل کر کیرل گائیں گے اور ہم ساتھ مل کر ایک دوسرے کا غم اور خوشیاں بانٹ لیں گے۔"

خالد سوچنے لگا کہ لیسوع مسیح بھی صلیب پر ایسے ہی تنہا رہے ہوں گے۔ ان سے بھی ساری قوم نے ایسی ہی ہمدردی کی ہوگی۔

کرسمس پوری دھوم دھام سے آگیا۔ اس نے کچھ کارڈ خرید کر اپنے ساتھیوں کو پوسٹ کر دیے۔ ایک مخصوص کرسمس کارڈ خرید کر مارگریٹ کو بھیجا۔ حالانکہ خالد نے اس پر بہت صاف تحریر میں اپنا پتا لکھدیا تھا۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

کرسمس کی ڈاک میں اس کے نام صرف ایک خط تھا۔ اور وہ بھی برٹش کونسل کا۔ اس خط میں لکھا تھا۔

"مسٹر اور مسز شلی ڈن، کرسمس کے دوسرے دن آپ کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی دعوت قبول کریں تو یہ ان کے لیے فخر کا باعث ہوگا۔"

خالد نے دعوت نامے کو میز پر رکھدیا۔ سامنے والی کھڑکی میں کرسمس ٹری کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ وہ انھیں بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

"کرسمس سے میرا کیا واسطہ۔ لیکن اس سے کیا ہوا، تہوار تو بہر حال تہوار ہوتا ہے۔ اور ایسے خوشی کے موقعے پر اکیلے رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

مسز شلی ڈن کے یہاں وہ کیوں جائے۔ کیا وہ مریض ہے، جسے علاج کے خیال سے مسز شلی ڈن کے اسپتال بھیجا جارہا ہے میں وہاں کیوں جاؤں ــــ مجھے سات بڈھے بڑھیاں تھینک یو

والی مسکراہٹ لیے میرا استقبال کریں گی۔ مجھے دیکھ کر انھیں بے انتہا مسرت ہوگی۔ وہ موسم کے بارے میں اظہار خیال کریں گی۔ اور پھر کہیں گی کہ ہم ہر سال اپنے یہاں سمندر پار کے طالب علموں کو بلاتے ہیں۔" اس پر میں کہوں گا: "ہم ہر سال زکوٰۃ نکالتے ہیں"

پھر وہ زکوٰۃ کے بارے میں سوالات کریں گے۔ میں اُن کو کیسے سمجھا پاؤں گا۔"

پھر اس نے سوچا کہ اگر وہاں کوئی ایسا بڈھا انگریز مل گیا جو ہندوستان میں بڑا صاحب بن کر زندگی گزار چکا ہوگا۔ تو پھر سچ مچ مصیبت ہو جائے گی۔ خالد کو ان انگریزوں سے شدید نفرت تھی جو ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان بولتے تھے۔

"چھوڑو اس مصیبت کو۔ تمھیں آخر وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ برٹش کاؤنسل کا خط دعوت نامہ ہے کوئی ڈاکٹر کا نسخہ تو ہے نہیں۔"

اور اس فیصلے کے بعد اس نے جیب سے اپنی ڈائری نکالی بی بی سی کا فون نمبر ملایا۔ آنند وہاں موجود تھا۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ تمھارا انتقال ہو چکا ہے۔ اتنے دنوں سے گم ہو۔ اور لندن میں جب کوئی دوست لاپتہ ہو جائے تو سمجھو کہ یا تو اس کے دن عید اور راتیں شب برات ہیں یا پھر وہ ہندوستان واپس چلا گیا ہے۔ اور واپسی کی اطلاع دوستوں کو اس لیے نہیں دی جاتی ہے کہ وہ ڈھیر سارا سامان لدا دیتے ہیں۔ اچھا خیر یہ بتاؤ کرسمس کیسا گزر رہا ہے؟"

"کرائسٹ بنا ہوا ہوں" خالد نے جواب دیا

آنند "سولی میں بھجوا دوں یا انتظام کر لیا ہے؟"

خالد "یہ بتاؤ آنند خوشی کے دن غموں کی پرچھائیاں اتنی گہری کیوں ہو جاتی ہیں؟"

آنند "عام آدمیوں کا ساتھ دو۔ خوشیاں مناؤ۔ کرسمس ٹری پر قمقمے جلا دو۔ کرسمس کے بہانے لڑکیوں سے گلے ملو۔ بس یہی طریقے ہیں تم نے تو عوام کو چھوڑ کر بڑے لوگوں کا سہارا لے لیا ہے۔

خالد: کون سے بڑے لوگ؟"

آنند: "کرائسٹ اور کون"۔ عوام کا ساتھ دو نہیں تو کرائسٹ تو تم خود بخود ہی بن جاؤ گے۔

خالد: "اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟"

آنند: میں کرسمس منا رہا ہوں، اور آج کے دن کہیں جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چلے آؤ؟

خالد نے فون رکھ دیا۔ اپنا کوٹ اٹھایا۔ سوئیس کاٹیج کا زمین دوز اسٹیشن پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ سلاٹ مشین میں ایک شلنگ ڈال کر جب اس نے ٹکٹ نکالا تو گاڑی کے آنے کی آواز سارے اسٹیشن پر گونج رہی تھی۔ اور ہوا کی تیزی کا وہ عالم تھا کہ لڑکیوں نے اپنے اسکرٹ سنبھال لیے تھے۔ مردوں کے ہاتھ ان کے پیٹ پر تھے۔ اور وہ ایک شخص اپنے اخبار کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ پلیٹ فارم کے مشرقی کونے پر کھڑی ہوئی ایک ادھیڑ عورت معلوم نہیں خوش تھی یا شرمندہ، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور

پاس کھڑا ہوا اجنبی معذرت کے انداز میں اس سے کہہ رہا تھا "کوئی بات نہیں ہم لوگوں کی چھتریاں بھی بالکل اسی طرح الٹ جاتی ہیں" لیکن وہ اجنبی در اصل سوچ رہا تھا کہ یہ عورت سرخ رنگ کی انڈر ویر کیوں پہنتی ہے۔

بی.بی سی کلب تک پہنچنے میں اُسے تقریباً آدھا گھنٹا لگا۔ کلب میں دروازے سے لے کر کاؤنٹر تک سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوار کے کاغذ پر گلابی رنگ کے بوٹے رنگوں میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے۔ سرمئی رنگ کی آرام دہ کرسیوں پر کالے سوٹ پہنے ہوئے لوگ اسمارٹ لگ رہے تھے۔ ان کی ستعدی اور ہوش مندی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کلب ابھی ابھی کھلا ہے۔ کاؤنٹر کے دائیں ہاتھ کی طرف دیوار کے کاغذ پر بڑے بڑے شیروں کا ڈیزائن بنا ہوا تھا اور شیروں کے اس پس منظر میں آنند جیسا اہنسا کا پجاری بیٹھا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا۔ خالد کو دیکھ کر آنند مسکرایا۔ ہاتھ پھیلا کر اس نے مصافحہ کیا۔ ایک لمبا کش کھینچ کر پائپ کو چھت کی طرف اٹھا کر فرش کی طرف ایک جنبا گلا جھٹکا دیا۔ اور تھوک کی بلی ہوئی نکوتین کی ایک لمبی سی لائین قالین پر ابھر کر ڈوب گئی۔

"کیوں موسیو کیا پیو گے؟"

"زہر کے علاوہ کچھ بھی پلا دو" خالد اُداس تھا۔

"اسی کو کہتے ہیں خط آیا حال معلوم ہوا۔ اتنے پریشان ہو تو زہر کے علاوہ کچھ بھی پلا دو کی جگہ تمھیں کہنا چاہیئے تھا —— زہر پلا دو

کمبختو زہر پلا دو"

"یہ بات نہیں ہے آنند ۔ زہر تو خوش نصیبوں کو ملتا ہے ۔ ہمارے نصیب ایسے کہاں ہیں"

"نہیں ہم تو آج تم کو خوش نصیب بنا کر رہیں گے" آنند نے میز پر سے سفید لیبل کی در تھنگٹن کی بوتل اٹھا کر دکھائی اور کہنے لگا "اس میں یہ نیچے جو ایک انچ بیئر کی تہہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ اسے دیکھو" آنند نے بوتل کو ذرا سا جھٹکا دیا ۔ اور بوتل میں بچی ہوئی بیئر کیچڑ کی طرح گدلی ہوگئی، وہ کہنے لگا ۔

"یہ سیڈی منٹ کہلاتے ہیں جو گدلی کے لیے زہر ہے۔ اسی لیے اس کو بوتل میں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ موسیو اس بیئر کا انڈیلنا خود اپنی جگہ ایک آرٹ ہے ۔ کیوں کہ گلاس میں سیڈی منٹ کا ایک قطرہ بھی نہیں آنا چاہیئے"

خالد آنند کی باتوں کو سنتا رہا ۔ کیوں کہ وہ شراب کے آداب اور قسموں سے زیادہ ناواقف نہ تھا ۔ لیکن جب آنند نے گلاس اس کے سامنے لا کر رکھا۔ تو اسے ورتھنگٹن کے دو گھونٹ میں کیک محسوس ہوئی ۔

آنند دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں لندن پہنچا تھا۔ اتنا عرصہ لندن میں گزارنے کے بعد اس کے مزاج میں انگریزیت کوٹ کوٹ کر بھر چکی تھی، تین پیس کا سوٹ پہننا۔ کلف دار کالر لگاتا ۔ گارڈین اور نیو اسٹیٹس مین پڑھنا اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ یوں تو اس کے بے شمار دوست تھے، لیکن سب سے پکا رشتہ اس نے

[illegible]

درتھنگٹن کی سفید لیبل کی بوتل سے وابستہ کیا تھا۔ اس بوتل میں جانے کیا جادو تھا کہ آنند کے چہرے پر شگفتگی۔ زبان پر روانی اور ذہن پر جلا ہو جاتی۔

آنند نے اس شہر کو مجبوری دور سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان دنوں لندن میں ہر چیز پر راشن تھا۔ شیشے کی فیکٹریوں میں بندوقیں ڈھل رہی تھیں۔ پبوں میں بیئر پینے کے لیے اپنے گلاس، تصویرِ جاناں دربغل کی طرح ساتھ لے جانا ہوتے تھے۔ اور چاکلیٹ تو لوگ دیکھنے کو ترس گئے تھے۔ ایک دن مجھے ایک بچے کی سالگرہ پر جانا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا تحفے لے کر جاؤں۔ میں نے اپنی لینڈ لیڈی سے مشورہ کیا۔ وہ کہنے لگی کہ تم نے اپنے راشن کارڈ کی چاکلیٹ تو لی نہیں ہے۔ وہی لے جاؤ۔ اور صاحب جب وہ چاکلیٹ کا ڈبہ لے کر میں سالگرہ میں پہنچا ہوں ......

آنند ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ جیکب جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا ہوا آ نکلا۔ اور وہ دور ہی سے چلّایا "یہ آپ کو چاکلیٹ کی کہانی سنا رہے ہوں گے — اور اگر واقعی سنا رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آنند صاحب چار گلاس اتار چکے ہیں"۔

آنند شرمندہ ہو کر مسکرایا — اور موضوع کو اس طرح بدل دیا جیسے قصہ مکمل ہو چکا ہو۔

جیکب نے بیس سال تک باندرہ کی ایک کھولی میں رہ کر اپنا رشتہ لندن کے لوگوں سے باندھے رکھا لیکن لندن پہنچ کر اس

پر یہ راز کھلا کہ اس کا وطن ہندوستان ہے ۔ اس کے گھر کے لوگ باندرہ میں ہیں ۔ اور برطانیہ میں وہ شہری نمبر دو کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے ۔ اس کے ذہن میں باندرے کی مٹی اس طرح جگمگا اٹھی تھی جیسے وہ اس کی اپنی زمین اپنی دھرتی اور اپنی مٹی ہو ۔

جیکب نے گھڑی دیکھی پھر کہنے لگا کہ ساڑھے چھ بج کر ایک منٹ ہو چکا ہے اور کریم صاحب ایک منٹ لیٹ ہو چکے ہیں ۔ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئے ؟" جیکب کی بات ابھی پوری نہیں ہونے پائی تھی کہ کریم صاحب سپسن کا جیکٹ پہنے اور منہ میں ڈن ہل کا موٹا سا پائپ دبائے ۔ چمڑے کا ایک بھاری بریف کیس ہاتھ میں لئے داخل ہوئے ۔ ادھر ادھر بس یوں ہی پھسلتی ہوئی نظر ڈالی اور وکٹورین انداز میں سلام قبول کرتے ہوئے سیدھے کاؤنٹر پر پہنچ گئے ۔ وہاں ایک دو لوگوں کو انھوں نے موسم کی تازہ رپورٹ دی ہی تھی کہ بارمین نے ورتھنگٹن کی سفید شیل کی بوتل ایک لمبے گلاس میں انڈیل کر ان کے سامنے بڑھا دی ۔

پچھلے پندرہ سال سے کریم صاحب روز اسی وقت کلب میں آتے ہیں ۔ موسم کو بڑے پیار سے فارسی کی گالی دیتے ہیں ۔ ایسے ہی سلام قبول کرتے ہیں ۔ یہی شراب پیتے ہیں ۔ ڈن ہل کا پائپ استعمال کرتے ہیں ۔ اور پہلا گلاس خریدنے کے بعد سارے کلب کا جائزہ لیتے ہوئے سوچتے ہیں کہ کس گروپ میں شامل ہوا جائے ۔ لیکن اگر جیکب اور آنند وہاں موجود ہوں تو انتخاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ساڑھے چھ سے سات بج کر پچیس منٹ تک وہ بیئر پیتے رہے ۔

کلب سے اسٹیشن کا راستہ پانچ منٹ کا ہے۔ ساڑھے سات بجے انھیں گھر جانے کے لیے ٹرین مل جاتی ہے۔

ان نپے تلے اصولوں کو وہ سالہا سال سے بڑے سلیقے کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ اور محفل سے اٹھنے کا سلیقہ کریم صاحب کو اتنا آ گیا ہے کہ ان کے کلب سے جانے کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد لوگوں کو ان کے موجود نہ ہونے کا علم ہوتا ہے۔

کریم صاحب نے اپنا گلاس اٹھایا اور بیئر کی پروردہ توند کو احتیاط سے سنبھالے گرجا گھر کے مقدس شمع دان کی طرح گلاس پکڑے ہوئے آگے بڑھے اور آنند کی میز پر آ بیٹھے۔ پھر بڑے پیار سے گالی دے کر کہنے لگے۔

"بچو۔ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو کرسمس کے دن مسل ٹو ہاتھ میں لے کر گھوما کرتے تھے۔"

جیکب بولا "اور اب مسل ٹو کے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔"

کریم صاحب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "بچے تم بہت بدمعاش ہو۔"

جیکب "کریم صاحب آپ کے زمانے میں لڑکی سے بڑا کام کرنے کے لئے اس سے شادی کرنا پڑتی تھی۔ اور اب زمانہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ وہی سب کام شادی کے بغیر ہو جاتے ہیں۔"

آنند خالد کی طرف متوجہ ہوا "یہ مسل ٹو کیا چیز ہے معلوم ہے؟"

خالد "نہیں۔"

آنند "اوہ غضب کر دیا۔ جانے کتنے موقعے تم نے ضائع کر دیے، وہ سامنے دروازے کی طرف دیکھو۔ بیچ میں جو ہری ہری پتیاں لٹک رہی ہیں یہی مسل ٹو ہے۔ اور اس کے نیچے جو بھی کھڑا ہو آپ لپک کر اس کا منہ چوم سکتے ہیں"

کریم صاحب کے جانے کے بعد آنند نے اپنی دوست جین کے قصے شروع کر دیے۔ جسے خالد بڑے غور سے سنتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ ان لوگوں نے لندن کو کتنا ڈوب کر دیکھا ہے۔ لیکن جب بیٹھے بیٹھے اس نے اگلی پچھلی باتیں نتھار کر ان کا ست نکالنے کی کوشش کی تو شراب اور عورت کے سوا اسے کچھ نہ ملا۔ وہ سوچنے لگا کہ لندن میں بسنے والے ہندوستانیوں کی زندگی میں دن بھر کی محنت کے بعد بس یہی دو بہلاوے ہیں۔ یہی دو موضوع ہیں۔

شراب اور عورت

ادھورے سوئٹر

(اداسیوں میں ڈوبے ہوئے قہقہوں کی منزل کافی دور نکلی ۔ درجنوں گلاس ، درشنگٹن کی بیئر اور مسلسل چار گھنٹے گزارنے کے بعد آوازیں تیز ہوگئی تھیں ۔ اور ہوش و حواس غائب ہو رہے تھے ۔ آنند کی زبان سے لفظ لڑھکتے ہوئے باہر آ رہے تھے جو کبھی نشانے پر بیٹھتے اور کبھی نشانے سے بہت دور چلے جاتے ۔ اور جب یہ متوالے دلائل سے زیادہ آواز کے نیچے دبنے لگے تو جیکب کو ایک دم خیال آیا اس کی بیوی انتظار کر رہی ہوگی ۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ سامنے سے تھکی ہاری میں آتی ہوئی دکھائی دی ۔

آنند کو اس وقت میں ہی کی ضرورت تھی ۔ وہ اپنی بحث بھول کر بڑے زور سے "ہیلو" کہتے ہوئے اٹھا اور میں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سیدھا کاؤنٹر پر چلا گیا ۔

"کیا پیوگی ڈارلنگ"

"شیفتشی ۔ "بڑی سردی ہے آنند" میں نے اطلاع دی ۔

"پھر کیوں نہ ایک برانڈی پی لو ۔ سردی کے لیے اچھی چیز ہے"

"نہیں تھینک یو"

جین خالد کو دیکھ کر مسکرائی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ خالد ح یہاں کیسے آ گیا۔

خالد "میں یہاں کرسمس منانے آیا ہوں"

جین۔ بڑی زور سے ہنسی "تب تو تمہیں لندن کے کرسمس کا کوئی ،ازہ نہ ہو سکے گا"

خالد "کیا کرتا یہی ایک دروازہ کھلا تھا"

جین خاموش ہو گئی۔ خالد جین سے پہلے مل چکا تھا۔ جین لیم اور عمر کی اس حد کو پہنچ چکی ہے جہاں شادی کا نازک سوال ،اری بھاری علمی سندوں کے نیچے دب جاتا ہے۔ دماغ اور زبان بڑے بڑے آئیڈیل جاری ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کسی گھنے سایہ دار ،خت کے نیچے بیٹھ جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جین کے چہرے پر غموں کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ سوچنے لگا۔ جین کسی زمانے میں بہت خوبصورت رہی ہوگی"

وہ ابھی گلاس سنبھال کر اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ،ب بند ہونے کی گھنٹی بجی۔ اور سب کو جیسے ایک دم ہوش لیا۔ جیکب دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے لوٹ پڑا۔

"کیوں بھائیو ONE FOR THE ROAD ہو جائے"

سب نے چلا کر تائید کی۔ اور چھلکتے ہوئے گلاسوں کی ایک ،ر بڑے متوالوں کے ہاتھ تک گئی۔

دس منٹ کے بعد کلب کی روشنیاں بجھ گئیں۔ بن رسے

کے صوفے پر ایک BOSS اپنی سیکریٹری سے ڈکٹیشن لے رہا تھا۔ بار مین کاؤنٹر سے باہر آ کر خالی گلاس سمیٹ رہا تھا۔ اور لوگ ہنستے ہوئے باتیں کرتے لڑکیوں کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے باہر نکل رہے تھے۔

باہر کہرا تھا۔ اندھیرا اور ٹھنڈک تھی۔ خالد نے مڑ کر دیکھا تو سب ساتھی تتر بتر ہو چکے تھے۔ اُسے صرف آنند اور جین ٹیکسیوں کی طرف لپکتے ہوئے دکھائی دیے۔ جین کہنے لگی۔

"خالد تم ہمارے ساتھ چل کر کھانا کھاؤ۔ تھوڑی بیئر بھی ہے،"

خالد اس حد تک شراب پی چکا تھا جہاں کم پینے کا اصول غوطے کھا جاتا ہے۔

ٹیکسی میں آنند اور خالد کے درمیان جین سینڈوچ بنی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی نظریں ٹیکسی کے وائپر سے چپک کر رہ گئی تھیں جو بڑی تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ جین جیسے ہی کسی خیال کا سرا پکڑتی۔ وائپر اسے رگڑتا ہوا۔ سلیٹ کو صاف کر کے نکل جاتا۔

خالد نے ایک دم اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا

"کیا سوچ رہی ہو جین؟"

"سوچ رہی تھی۔ ڈرائیور کے سامنے شیشے پر اگر یہ وائپر نہ لگا ہوتا تو ایسے موسم میں گاڑی چل نہیں سکتی تھی۔ موسم اچھا ہو تو یہ کتنی بے جان حقیر سی چیز ہوتی ہے لیکن ضرورت پڑنے پر یہی وائپر سب کچھ ہو جاتا ہے۔"

خالد "جین کوئی اچھی بات سوچو۔ میرا خیال ہے تمہیں شیندی

کے ایک اور گلاس کی ضرورت ہے "

جین "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں موسم اچھا ہو تو یہ کتنی بے جان حقیر سی چیز ہو جاتی ہے۔ خالد مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک وائپر ہوں اور آنند ایک ڈرائیور ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں "

آنند جین کے موڈ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جین اس وقت اپنے ماضی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ ایک دم بول اٹھا۔

"جین اب تم پھر بہک رہی ہو "

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ضرورت پڑنے پر یہ وائپر سب کچھ ہو جاتا ہے۔ شراب پی کر تمہیں میری ضرورت میری کمی کے بعد میری طلب محسوس ہوتی ہے "

آنند کی آواز اونچی تھی "نہیں بالکل نہیں ہوتی۔ میں نے آج تک تمہیں شراب پینے کے بعد کبھی ٹیلیفون نہیں کیا ہمیشہ تم خود آ ٹپکتی ہو "

جین جیسے کوئی بلی کسی پھندے میں پھنس کر کچھ بھی نگاہوں سے رحم کے لیے اپیل کر رہی ہو۔ اس کی نیلی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ اس نے آنند کے کندھے پر منہ رکھ دیا۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئی اور باسکٹ میں سے ادھ بنا بچے کا سوئٹر نکال کر پھندے ڈالنے لگی۔

آنند جین کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر کہنے لگا۔

"HAPPY CHRISTMAS"

جین کے سارے غم جیسے آنند کے دو لفظوں نے دھو ڈالے
دہ آنند کے اور قریب کھسک آئی، خالد نے بات ٹالنے کی غرض سے گفتگو چھیڑی۔

"بڑا خوبصورت سوئٹر ہے۔ کس کے لیے بن رہی ہو؟"

جین "میری ایک بہن ہے۔ اس کے بچے کے لیے۔ تمھیں پسند ہے؟"

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ آنند نے ٹیکسی رکوائی، "بس یہی گھر ہے۔"

پہلی منزل کا تاریک کرہ آنند کا ہے۔ آنند میں اب صرف انٹلیکچول بننے کی انرجی باقی رہ گئی ہے۔ ذمے داریوں سے فرار ڈھونڈ کر اس نے صرف کتابوں اور دوستوں سے محبت کی ہے۔ دوستوں کے دلوں میں محبت کا بیج بویا ہے اور کتابوں کے اوراق پر جگہ جگہ پنسل کے سُرخ نشان چھوڑے ہیں۔ یہ سُرخ نشان عام طور پر وہ سطریں ہیں جہاں آنند اور مصنّف کی طرز فکر ایک ہوگئی ہے۔

کمرے میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ بیئر اور دودھ کی بیسیوں خالی بوتلیں ہیں۔ بیچ کی میز پر چائے کی چھوٹی پیالیاں، ٹوسٹر سگریٹ کے خالی پیکٹ، ٹیپ ریکارڈر، ٹوتھ برش اور داڑھی بنانے کا سامان رکھا ہے۔ کرسی پر پتلون صوفے پر ٹائیاں اور میز کے نیچے سلیپنگ سوٹ ہے۔

جین نے جلدی جلدی کرسیاں خالی کیں۔ جیسے یہ اس کا اپنا

گھر ہو۔ بیئر کی خالی بوتلوں میں سے تین چار بھری ہوئی بوتلیں الگ کیں اور گلاسوں کو آگے بڑھا کر کھانے کا سامان دیکھنے لگی

آنند نے احتیاط سے گلاس بھرے اور جین کی طرف گلاس بڑھاتے ہوئے چیرز کہہ کر ایک گھونٹ لیا۔ پھر کہنے لگا۔

"میرے پاس قیمہ اسپیگیٹی کے کئی ٹن رکھے ہیں۔ تمھیں پسند ہو تو ہندوستانی انداز سے پکایا جائے"

خالد نے پوچھا "کتنی دیر لگے گی۔ ساڑھے گیارہ پہلے ہی بج چکے ہیں" آنند تفصیل بتانے لگا "مشکل سے سات منٹ لگیں گے۔ پیاز داغ کی۔ دو چمچے کری پاوڈر، ایک چمچا لال مرچ اور تھوڑا پانی ڈال کر ایک ابال دے دیا۔ اس کے بعد اسپیگیٹی کے ڈبے کھول کر اس میں الٹ دیے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ صرف پانچ منٹ لگیں گے۔

جین کہنے لگی "کھانے کی کیا جلدی ہے۔ آنند تم خالد کو اپنی وہ نئی نظم سناؤ جو تم نے مجھ پر کہی ہے"

خالد ایک دم چونکا "آنند تم نے شاعری کب سے شروع کی؟"

"پچھلے دس سال سے میں شاعری کر رہا ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے جس دن سے میری جین سے ملاقات ہوئی ہے"

اور انگریزی بولتے بولتے اس نے چپکے سے ایک جملہ ہندوستانی میں کہہ دیا "غالب کی غزل اپنی کہہ کر سنائی تھی"

"کیا کہا تم نے آنند" جین نے سوال کیا

"کچھ نہیں ڈارلنگ زبان کی، کچھ ایسی نزاکتیں ہوتی ہیں جن کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ہے، میں نے تمھاری والی نظم کا ایک

مصرعہ ان کو سنا دیا تھا۔"

جین کے چہرے پر شینڈی کی سُرخی کو دباتی ہوئی مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

بوتلوں کی شراب ذہن پر کسی ہوئی نگاہوں کو لے کر غائب ہو چکی تھی۔

آنند کھانا پکانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اور وہ خوبصورت اداس لڑکی خالد کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکھڑاتی زبان سے پوچھ رہی تھی۔

"خالد قسم کھاؤ کہ آنند نے یہ نظم میرے اوپر کہی ہے۔"

خالد: تمھیں اس میں شبہ کیوں ہے۔ جین تمھاری آنکھوں پر تمھارے خوبصورت ترشے ہوئے ہونٹوں پر، تمھاری اس سڈول ناک پر الگ الگ نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔" خالد سرور میں بہک رہا تھا۔

جین "خدایا یہ مشرقی لوگ۔ آج سے پچھلے سال پہلے بالکل یہی بات ایک پاکستانی لڑکے نے کہی تھی۔ یہی پھندے تھے جن میں ایک ناتجربہ کار لڑکی الجھ گئی تھی۔"

جین کی آواز میں یادوں کے دیے لو دینے لگے تھے "اور مجھے دو سال کے بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکا نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کی ہندوستانی بیوی یہیں لندن میں ہے۔ اس رات، شاید پہلی دفعہ میں زار و قطار روئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی کے سارے دروازے مجھ پر ــــ بند ہو گئے ہیں۔ اور اسی موڈ میں میری ملاقات آنند سے ہوئی تھی۔"

خالد : "اچھا تو آنند تم سے اس طرح ملا تھا"
جین : "آنند نے اپنے بریف کیس سے بہت سی سلیپنگ پلز نکال کر مجھے دیں اور کہنے لگا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ زندگی میں اب کچھ نہیں رہا ہے تو یہ گولیاں تمہارا ساتھ دیں گی۔ اور اگر ابھی زندگی سے مایوس نہیں ہوئی ہو تو آؤ میرے ساتھ۔ چلو رقص کریں گے۔"
خالد "اور پھر تم رقص کرنے پر تیار ہو گئی تھیں"
جین "نہیں میں زندہ رہنے پر تیار ہو گئی تھی"
جین کے اس موڈ نے کمرے کی فضا بدل دی۔ خالد خاموش تھا۔ جیسے اب اس موضوع کو بند کر دینا چاہتا ہو۔ آنند خود اپنی یادوں کے مزار میں دفن تھا۔ اس کی زندگی میں اب کسی جین کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ پختگی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں دوسروں کی ہر بات مکمل ذہنی پس منظر میں سنائی دیتی ہے۔ اور برا ماننے یا شکوے شکایت کرنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور خیالات کی رو بدلنے کے لیے خالی میز پر پلیٹیں سجانے لگا۔
جین شراب پی کر ہمیشہ مغموم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اپنی پلیٹ ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نشہ نہ خطا ہو گیا۔ سناٹا چیخنے کی آواز ابھری اور چینی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو پھول کی پنکھڑیوں کی طرح بکھیرتی ہوئی گم ہو گئی
"تم کیوں اتنی شراب پیتی ہو؟" آنند گرجا۔
"میں اتنی شراب اس آپریشن کے بعد سے پیتی ہوں۔

کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے ڈارلنگ۔ خالد انھوں نے میرا آپریشن کرا دیا ہے۔ اب میرے بچّے کبھی نہیں ہوں گا۔ میں سدا بانجھ رہوں گی۔ میں بانجھ رہوں گی " اور جین یہ کہتے کہتے زار و قطار رونے لگی۔

خالد کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر وہ کیا کہے۔ وہ کیسے ہمدردی کرے۔ نصیحت کرنا اُسے سب سے زیادہ آسان معلوم دیا۔

خالد " جین سب بچّے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم اپنی بہن کے بچّے سے محبت کر سکتی ہو "

جین کا ایک کھوکھلا قہقہہ دم دار ستارے کی طرح ٹوٹا۔ اس کی لمبی روشن دم آہستہ آہستہ تاریکی میں بجھتی چلی گئی۔ جین کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔

خالد نشے میں لڑکھڑاتا ہوا اپنا اوور کوٹ تلاش کرنے لگا۔ وارڈ روب کھولا تو اس کی نظریں ایک کونے میں جم کر رہ گئیں۔ بچّوں کے آٹھ دس اُدھ بنے سوئیٹروں کا ایک ڈھیر تھا۔ اُس نے آنند کو غور سے دیکھا۔

خالد " یہ سوئیٹر تم جین کی بہن کو بھوا کیوں نہیں دیتے "

" شی ــــ " آنند سنجیدہ ہو کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔

" جین کے کوئی بہن نہیں ہے "

●

خالی کمرے

لندن کا بھی کوئی موسم ہوا۔ گرمیاں ہیں تو رات کے گیارہ بجے تک دن کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور سردیاں ہیں تو ہفتوں سورج مہاراج کے درشن کو آنکھیں ترس جائیں۔ کہر اور میلے بادلوں کے پیچھے سورج جانے کب نکلتا اور کب ڈوبتا ہے۔ دھرتی سے اس کا جو بھی سمبندھ ہو، لندن والوں کا اس سے صرف ذہنی رشتہ ہے۔ یہاں اجالے کے انتظار میں سونے والے بہت دیر تک سوتے رہ جاتے ہیں۔

خالد کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو سوٹ پہنے اور جوتے چڑھائے بستر پر پایا۔ گھڑی کی دونوں سوئیاں تین کے ہندسے پر لٹک رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

دودھ کی بوتل، گارڈین اخبار اور کچھ خطوط باہر دروازے پر پڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اور لینڈ لیڈی انھیں دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ خالد شاید رات گھر نہیں واپس آیا۔ ورنہ دودھ کی بوتل دروازے پر نہ ہوتی۔ کمرے کی صفائی کے لیے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو خالد اندر تھا۔

لینڈ لیڈی نے گڈ مارننگ ڈیئر کو حسب عادت مختصر کرکے داغ دیا — گموُن ڈیا"

"گڈ آفٹر نون مسز تھامس۔ آج کیسی ہیں آپ؟"
"کتنا بے ہودہ موسم ہے"
خالد" مجھے ایسے موسم سے نفرت ہے۔ مسز تھامس یہ موسم مایوسی پھیلاتا ہے — میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟"
مسز تھامس مسکرانے لگیں۔ لیکن عام طور پر ان کے مسکرانے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے خالد نے مسکراہٹ کا مطلب سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ پھر خود ہی کہنے لگیں۔
"ڈِک کا فون آیا تھا اس نے کہا ہے کہ جیسے ہی تمھیں فرصت ملے اسے فون کر لو"
خالد" آپ کو بڑی زحمت ہوتی ہے میری وجہ سے"
لینڈ لیڈی: "زحمت کی کیا بات ہے۔ ویسے ایک بات اور یہ خط میں تم کو دینا چاہتی تھی"
خالد نے بغیر ایڈریس کا خط کھولا۔ مضمون پڑھتے پڑھتے اس کا رنگ اڑتا گیا۔ نیچے دستخط مسز تھامس کے تھے۔
خالد" لیکن مسز تھامس میں اتنی جلدی کیسے چھوڑ سکتا ہوں"
"تمھارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ میں مجبور ہوں خالد۔ میں چاہتی نہیں تھی لیکن تمھارے پڑوسی کئی دفعہ شکایت کر چکے ہیں"
خالد" ایک دفعہ اور آخری دفعہ موقعہ دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب میں ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑے اہم مسئلوں کی طرح اہمیت دوں گا"
لینڈ لیڈی " اس سے پہلے کئی دفعہ ہم لوگ یہ بات کر چکے

ہیں۔ کتنی دفعہ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ تمہارے پڑوسیوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ تم پتلون کی جگہ پاجامہ پہن کر کمرے سے باہر نکلتے ہو اور گاؤن پہننے کی زحمت کبھی نہیں کرتے۔ ہمیشہ دروازہ کھول کر ریڈیو سنتے ہو۔ ہمیشہ زینے پر زور زور سے باتیں کرتے ہو۔ اور ہمیشہ ہم لوگ اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔"

خالد: مسز تھامس بس اب سب نصیحتیں میں نے یاد کرلی ہیں۔ ان کو لکھ کر میں اپنے کمرے میں ٹانگ دوں گا۔ تاکہ آپ کو دوبارہ نہ یاد دلانا پڑے۔"

لینڈ لیڈی: "تمہیں اس گھر میں رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میرے تین کرایہ دار کمرے خالی کرکے چلے جائیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ خالد اس نوٹس کے علاوہ میرے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔" لینڈ لیڈی کسی قدر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

خالد کے پاس بھی سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن آج اسے پہلی دفعہ انگریزی کلچر کا اندازہ ہوا۔ آج تک اس نے کمرے سے باہر نکلتے وقت سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہننے کو اتنی سنجیدگی سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اگلے ہفتے تک کوئی دوسرا کمرہ تلاش کرلے گا۔ اس کا اسے پورا یقین تھا۔

اب تو ڈک کو ٹیلیفون کرنا اور ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ چار پینی ڈال کر نمبر ملایا تو ٹیلی فون پر ڈک کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو ڈک — تم نے فون کیا تھا؟"

"ہاں تمھیں ایک دعوت دینا تھی "

"لیکن ڈِک میں صرف ایسی دعوت میں جا سکتا ہوں، جہاں اپنا بوریا بستر ساتھ لے جا سکوں ۔ مجھے مسز تھامس نے نوٹس مجھے دیا ہے کیوں کہ میں سلیپنگ سوٹ پر گاؤن نہیں پہنتا ہوں ۔ اور بحیثیت مجموعی بدتمیز آدمی ہوں "۔

ڈِک " اس میں تو کوئی شبہ نہیں خالد۔ لیکن میں تم سے زیادہ بدتمیز سفید چمڑی والوں سے مل چکا ہوں ۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ میں تمھارے لیے جگہ کا انتظام کر دوں گا ۔ لینڈ لیڈی نے کتنے دنوں کا نوٹس دیا ہے"۔

خالد "۔ میں اپنے گھر کے مہذب لوگوں کو سات دن اور پریشان کر سکتا ہوں "۔

ڈِک " سات دن میں تو اوپر والے نے ساری دنیا کی تخلیق کی تھی "۔

خالد :" کائنات کی تخلیق اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا کہ ایک کالے آدمی کو کمرہ تلاش کرنا ہے ۔

ڈِک : " تم ٹھیک کہتے ہو۔ پریشان نہ ہو۔ میں موجود ہوں۔ میں نے تمھیں فون اس لئے کیا تھا کہ MOTHERS DAY آ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اور لِل کے ساتھ تم بھی ممی سے ملنے چلو۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ تمھیں بھی تو اپنی ممی یاد آتی ہوں گی۔ میری ممی سے ملو، شاید تمھارے درد کی دوا ان کے پاس ہو"۔

خالد : " میں ضرور چلوں گا ۔ لندن آ کر محبت کو ترس گیا ہوں۔

ڈِک مجھے کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جو مری کمزوریوں کو

نظر انداز کر کے مجھ سے محبت کر سکے۔ خوبیوں سے محبت کرنے والے تو سب ہی ہوتے ہیں"۔

ڈک: "تو پھر طے رہا۔ تم میرے ساتھ چلو گے"۔

خالد: "ہاں طے رہا لیکن اگر تم کسی وجہ سے نہ جا سکو تو مجھے ان کا پتا دے دینا"۔

ڈک: "تمہارے مزاج میں انگریزی ہیومر کہاں سے آ گیا ہے"۔

"دو سو سال لگے ہیں اس میں" خالد زیر لب مسکرایا۔

لیکن اس کی مسکراہٹ ٹیلی فون پر ضائع ہو گئی۔

ڈک: "سیاست ہم لوگوں نے ملکہ معظمہ کی انگریزی بولنے والوں کے لیے چھوڑ رکھی ہے"۔ دونوں طرف سے قہقہہ بلند ہوا، اور ٹیلی فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔

کہر اور بارش اور دھند کے دن، پنشن کی امید میں جینے والے کلرک کے دنوں کی طرح گھسٹتے ہوئے ہانپتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ڈک کی کار "ہیم سٹڈ ہیتھ" سے ہوتی ہوئی کون کون سی گلیوں کا چکر کاٹتی "مزول ہل" کی ایک کشادہ سڑک پر رک گئی۔ اٹھارہ نمبر کے مکان کے سامنے ایک نئی اسپورٹس کار کھڑی تھی۔ سامنے دروازے پر بل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مسز کک کی مسکراہٹ پھیل کر کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور ان کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے۔

پشت کے کمرے میں ایک بڑی سی تصویر لٹک رہی تھی۔ جس میں ایک خوبصورت اور وجیہہ نوجوان دو پیارے پیارے بچوں کو گود میں لیے کھڑا تھا۔ یہ ہیں مسٹر کک۔ ڈک اور بل کے مرحوم

باپ۔ سائپرس میں انگریزی راج مسٹر لگ کو ورثے میں ملا تھا۔ اور اسی سرزمین پر ملکہ معظمہ کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے ایک انقلابی کی گولی سے مارے گئے تھے۔

ممی نے دن رات کی محنت کے بعد ان دونوں بچوں کو محبت کرنے، شادی کرنے اور الگ گھر بسانے کے لائق بنایا ہے۔ اب ان بچوں کے اپنے مکان ہیں اپنی کاریں ہیں جن کی قسطیں ادا کرنے کے لئے انہیں اوور ٹائم کرنا ہوتا ہے۔ اوور ٹائم کی تھکن اتارنے کے لیے اتوار کے دن آرام کرنا ہوتا ہے۔ اور انھیں اکثر احساس ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی کے اصل دن بہت دن پہلے نکل چکے ہیں اور اب زندگی کا صرف ایک مقصد ہے۔

"ادھار کی قسطیں ادا کرنا"

لیکن پھر بھی سال میں دو دن۔ کرسمس اور MOTHERS DAY پر یہ بچے اپنی ماں کو جو اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ کبھی نہیں بھولتے۔ ڈک اور بل دونوں پوری ایمانداری سے اپنے کو سعادت مند بیٹا سمجھتے ہیں۔ ممی کے لیے سال میں دو دن کا جو کوٹا مقرر ہے وہ اس سے مطمئن رہتی ہیں۔

مسز لگ خالد سے کچھ اس طرح گھل مل گئیں جیسے وہ بھی ان کا اپنا بیٹا ہو۔ ڈک اور بل اطمینان سے بیٹھ کر بحث کرنے لگے کہ ممی کے گھر آنے کے لیے سب سے چھوٹا راستہ کون سا ہے۔ اس بحث میں کوئی پندرہ منٹ صرف ہوئے ہوں گے کہ بل نے بات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر دونوں بڑی دیر تک اپنی اپنی بات کاروں کے تکنیکل مسائل ایک دوسرے کو سمجھاتے رہے۔

بیچ بیچ میں ممی کبھی بل کا اور کبھی ڈک کا ساتھ دیتی رہیں۔ خالد سوچتا رہا کہ ممی بحث میں حصّہ لینے کے لیے نہیں بلکہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے بول رہی ہیں۔

خالد کا خیال غلط تھا۔ ممی کو اپنے بچّوں سے دلچسپی ہے۔ ان کی ہر بات سے دلچسپی ہے۔ ان کے ہر مسئلے سے دلچسپی ہے چاہے وہ موٹر کار کے کاربوریٹر کی ہو اور چاہے ٹیلی وژن کے پروگرام کی۔

پھر ڈک نے اپنے مکان کی بات چھیڑ دی۔ جسے اس نے خود سجایا ہے۔ دیواروں پر سفیدی کی جگہ وال پیپر چسپاں کیے ہیں۔ وہ بتانے لگا کہ کاغذ کو صفائی سے چپکانے کے کیا گُر ہیں۔ بل نے بات کاٹ کر فٹ بال پول کے جوئے کا ذکر چھیڑ دیا۔ باتوں کے درمیان جب ذرا سا وقفہ آیا تو ممی کہنے لگیں "میں نے پڑوس کی ڈیری سے سامان خریدنا چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ وہ اب سامان کے ساتھ ٹکٹ کے کوپن نہیں دیتا ہے"۔

ممی کے پاس ایک کر کے تقریباً چار سو کوپن جمع ہو چکے ہیں۔ تھوڑے اور ہو جائیں تو پھر کمرے کو گرم رکھنے والا ہیٹر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بے سر پیر کی ایک سے دوسری بات نکلتی رہی۔ آخر ڈک کو خالد کا مسئلہ یاد آ گیا۔

ڈک: "ممی تمہاری وہ چرچ والی دوست جو ہیں، ان کے گھر میں ایک کمرہ خالی تھا۔ اگر وہ اب بھی خالی ہو تو خالد کو دلوا دو یہ گھر سے نکال دیا گیا ہے"۔

ممی : "ہاں کل ہی تو وہ کہہ رہی تھی۔ خالد بیٹے تم کو فون نمبر دیتی ہوں تم بات کرلینا۔ یا تم وہاں چلے جاؤ۔ بہت اچھی دین دار عورت ہے۔ چرچ ویلفیئر کمیٹی کی سکریٹری ہے "

خالد فون نمبر لکھ کر جیب میں رکھنے جا رہا تھا کہ ڈک بولا۔
" خالد فون یہیں سے کرلو۔ اسی وقت کرلو "

خالد : " جلدی کیا ہے کرلیں گے "

ڈک : " تم سمجھتے نہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہیں سے اسی وقت فون کرلیتا "

خالد : " چھوڑو آج MOTHERS' DAY ہے۔ آج اس قسم کے بے کار کام نہیں کرنا چاہئیں۔ اچھی اچھی باتیں کرو "

ڈک : " تم بے کار بات کر رہے ہو۔ چلو اٹھو۔ فوراً فون کرو "

بل : " ٹھیک ہے بعد میں کرلے گا "

ڈک : " لاؤ میں فون ملائے دیتا ہوں۔ کچھ کام ہوتے ہیں جن میں تاخیر خودکشی کے برابر ہوتی ہے "

خالد : " میں خود ہی ملائے لیتا ہوں "

نمبر گھمانے کے دو لمحے بعد دوسری طرف سے کوئی معمر عورت بول رہی تھی۔ خالد نے جب معلوم کرلیا کہ خود لینڈ لیڈی بات کر رہی ہے تو کہنے لگا۔

خالد : " معاف کیجیے میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کمرے کرائے پر دیتی ہیں "

لینڈ لیڈی : " جی ہاں۔ دیتی ہوں "

خالد : "کیا کیا سہولتیں ہیں ۔
لینڈ لیڈی : "ہیٹر ہے ۔ چولھا ہے ۔ وارڈ روب ہے ۔ پانی کا انتظام ہے ۔ گیزر ہے ۔ سب ہی کچھ ہے"
خالد : "تب تو واقعی سبھی کچھ ہے ۔ کیا یہ کمرہ مجھے مل سکتا ہے
لینڈ لیڈی : "کیا آپ طالب علم ہیں"
خالد : "میں ہندوستانی طالب علم ہوں ہوں ۔ اور کافی دنوں سے لندن میں ہوں ۔
لینڈ لیڈی : "بات در اصل یہ ہے کہ ایک صاحب کمرے کے لیے ایڈوانس دے کر گئے ہیں ۔ اگر وہ نہیں آتے تو میں کمرہ آپ کو دے دوں گی"
خالد : "تو کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ کمرہ کرایہ پر دیا جا چکا ہے"
لینڈ لیڈی : "آپ کا جو جی چاہے سمجھئے ۔ میں نے صحیح پوزیشن آپ کو بتا دی ہے"
خالد : "شکریہ ۔ آپ کا وقت ضائع کرنے پر مجھے افسوس ہے ۔
سب کے سب خاموشی سے اور توجہ سے خالد کی باتیں سن رہے تھے ۔ ڈک نے ایک زور دار قہقہہ لگایا ۔ تینوں نے مڑ کر اسے دیکھا ۔ اور ممی کسی قدر غصے سے بولیں "اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی"
ڈک ہنسے چلا جا رہا تھا ۔ اور سب سوالیہ نشان بنے ہوئے اُسے دیکھ رہے تھے ۔ آخر ہنسی ضبط کرتے ہوئے ڈک

بولا۔ "ممی ایک شرط لگاتی ہو؟"

"کیسی شرط؟" بل نے مسئلے سے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

ڈک نے طنز کیا: "مجھے یقین ہے کہ یہ کمرہ ابھی تک خالی ہے۔ چوں کہ خالد اتفاق سے ہندوستانی ہے اور کالے رنگ کے لیے چاہے اس کا شیڈ ہلکا ہی کیوں نہ ہو، ہر دروازہ نہیں کھلتا۔"

ممی: "ڈک بیٹے ایسی باتیں نہیں کرتے ہیں۔ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بغیر کسی کو جانے ہوئے شبہ نہ کیا کرو۔ اس نے اپنی زندگی چرچ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ دو ہزار روپے دے کر اس نے چرچ میں اپنے لیے مخصوص نشست کا انتظام کیا ہے۔ وہ غریبوں کے لیے دن رات چندے جمع کرتی رہتی ہے۔ بھلا ایسی عورت کالے اور گورے کا فرق دیکھ سکتی ہے۔"

ڈک: "تم نے اس کی تعریف میں جتنی باتیں بتائی ہیں۔ ان سے میرا شک اور پختہ ہو گیا ہے۔"

بل جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا کہنے لگا۔

"ممی میں تم سے متفق ہوں لیکن اب تمھارا فون کر کے صحیح بات معلوم کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ورنہ خالد ہم لوگوں کے بارے میں غلط رائے قائم کر لے گا۔"

تینوں نے ممی پر اس طرح نظریں گاڑ دیں کہ وہ نروس ہو گئیں۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور چھے آنکھیں ممی پر اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ٹیلی فون کے نمبر گھومے دوسری طرف چرچ کی سکریٹری بول رہی تھیں۔

ممی : "ہلو ڈیر۔ تم نے کہا تھا کہ تم اپنا ایک کمرہ کرائے پر اٹھانا چاہتی ہو۔ تو کیا وہ کمرہ اب بھی خالی ہے ؟"

تینوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ لیکن ممی کو پورا اعتماد تھا۔ کمرے کے سناٹے میں دوسری طرف کی آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔

"ہاں مسز گک ابھی تک خالی ہے۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو فوراً لے لیجیے۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں ؟"

مسز بک نے ایک شکست خوردہ نظر ڈک پر ڈالی۔ ڈک نے سرگوشی کے انداز میں مشورہ دیا۔

"بک کر دو فوراً"

ممی نے خالد پر ایک نظر ڈالی اور پھر بڑے اعتماد سے بولیں۔

"تو ڈیر تم اسے میرے بیٹے کے لیے بک کر دو ؟"

فون بند کر کے وہ خالد کی طرف بڑھیں۔ اس کے گال بڑے پیار سے تھپتھپاتے پھر کہنے لگیں "آج سے تم میرے تیسرے بیٹے ہو ؟"

ڈک صوفے پر پھیلتے ہوئے بولا "ممی اسی لیے کہتا ہوں چرچ سے ڈرو۔ اس کانب میں طرح طرح کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ اس عورت کو ہر مرد سے شکایت ہو گی۔ پچاس سال کا عرصہ نصف صدی کہلاتا ہے۔ اور نصف صدی میں ایک مرد مجاہد سامنے نہ آیا جو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور نکاح کے لیے بیٹھ جاتا۔ کسی ایک انسان نے اس کھور پر پڑے ہوئے موتی کو نہ پہچانا۔

ممی سچ کہتا ہوں اب اس نے اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے

چرچ کا سہارا لیا ہے۔ اور انتقام کے لیے ہر اس شخص کو دبوچا ہے جو اس سے کسی طور پر ذرا سا کم ہو"

مسز رِک بہت شرمندہ تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ رنگ کا فرق زندگی پر کیا اثر ڈال سکتا ہے۔ یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خالد اگر ہندوستان کی گرمیوں میں مجھے رہنا پڑے تو میری جلد کا رنگ بھی تمہاری طرح ہو جائے گی"

خالد: "ممی یہ تو بڑا فطری جذبہ ہے۔ خود ہمارے یہاں جب بچّہ پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہ سوال کیا جاتا ہے۔ "کیسا ہے بچہ: کالا یا گورا" اور جہاں تک محبت کا تعلق ہے وہ تو ساتھ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو رات کو جلدی سلانے کے لیے میری ماں مجھے ڈرایا کرتی تھی۔ اور جانتی ہو وہ کیا کہتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "جلدی سے سو جاؤ نہیں تو گورا اٹھا کر لے جائے گا" اور ننھا سا بچّہ سہم کر سو جایا کرتا تھا ڈِک تم لوگ اپنی سرزمین پر کیسے پیارے لگتے ہو۔ اور تو آبادیوں میں جا کر تمہارا یہی حسن کتنا بھیانک ہو جاتا ہے"

بل: "میرا خیال ہے کہ انگلینڈ کا ہر نکمّا آدمی کالوں کے خلاف ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں کا الزام کسی نہ کسی کے سر تھوپنا جو ٹھہرا"

خالد: "لیکن بل میرا خیال ہے کہ نفرت سے زیادہ غلط فہمیاں اس منافرت کا سبب ہیں۔ باہر والوں کو یہ نہیں معلوم کہ کم سے کم دوست رکھنا تمہاری فطرت ہے اور کم سے کم گفتگو کرنا تمہارا محبوب

مشغلہ۔ اور اسی لیے باہر والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ایک بھی باہر کا آدمی تمہاری مجلس میں آجائے تو تم گونگے بن جاتے ہو اور اگر بولتے بھی ہو تو تمہارے جملوں سے وکالت کی بو آنے لگتی ہے جیسے اخباروں کو بیان دے رہے ہو۔"

ڈِک اور بِل اور می پوری توجہ سے خالد کی باتیں سن رہی تھیں اور خالد تھا کہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

"ابھی کچھ دن کی بات میرے ایک دوست فنچلے روڈ اسٹیشن سے گلبرن جا رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ میں ان کی بائیں طرف ایک سیٹ خالی تھی۔ اگلے اسٹیشن پر ایک بڈھا انگریز داخل ہوا۔ اس نے میرے دوست کو غور سے دیکھا۔ دوست نے خالی سیٹ کی طرف اشارہ بھی کیا۔ لیکن بڈھا انگریز شکریہ ادا کر کے ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ اپنی عینک نکالی اور پھر اخبار نکال کر اس میں اپنا منہ چھپا لیا۔

میرے دوست کو انتہائی غصّہ آیا۔ وہ افسوس کرنے لگا۔ کہ آخر میں نے اس متعصب آدمی کو سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیوں کیا۔ جو شخص کالے آدمی کے پاس بیٹھنا تک گوارا نہ کرتا ہو اُسے تو دھکے دے کر باہر پھینک دینا چاہیے۔

اتفاق سے دوسرے دن پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ وہ بڈھا انگریز آیا۔ اس نے غور سے میرے دوست کو دیکھا۔ لیکن آج میرے دوست نے اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ بڈھا حسب دستور کنارے کھڑا ہوا، عینک نکالی اور اخبار کے پیچھے منہ چھپا لیا۔

لیکن آج میرے دوست کی دائیں طرف جو انگریز بیٹھا تھا

اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بڑی ملائمیت سے بولا۔
"معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس علاقے میں نئے نئے آئے ہیں۔ یہ بڈھا جو کنارے کھڑا اخبار پڑھ رہا ہے۔ یہ پچھلے دس پندرہ سال سے اسی وقت، اسی ٹرین میں اسی ڈبے میں اور اسی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرتا ہے جس پر آپ بیٹھے ہیں جو لوگ اسے جانتے ہیں وہ سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہیں تو وہ خود کنارے کھڑے ہو کر اخبار پڑھتا رہتا ہے۔
میرے دوست نے جب یہ قصہ سنا تو اسے شرم محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھا۔ مسٹر اینڈ ریوز کے پاس جا کر معافی مانگی اور اصرار کیا کہ آپ آکر اپنی سیٹ پر تشریف رکھیے۔ بڈھے نے بہت تکلف کیا۔ لیکن میرے دوست کا اصرار اسے لے ہی آیا۔ وہ کئی بار شکریہ ادا کرتے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گیا۔
ہاں اب تم ہی بتاؤ۔ شروع میں میرے دوست نے انگریزوں کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ کتنی غلط تھی۔ یا کم از کم اس کی بنیاد کتنی غلط تھی۔ خاموشی کے گرد کتنی بہت سی غلط فہمیاں لپٹی رہتی ہیں:"
ممی خاموشی سے خالد کا لکچر سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں محبت کا جذبہ امنڈ آیا تھا۔ اور وہ خالد کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھیں کہ ڈیڈی کھڑا ہو گیا۔ اٹھ کر آتش دان کے پاس گیا۔ اور الارم کلاک اٹھا کر چابی دیتے ہوئے کہنے لگا۔
"ہم لوگ سونے سے پہلے گھڑی میں چابی دیا کرتے ہیں"

یادوں کے مزار

ایسا لگتا تھا کہ لینڈ لیڈی نے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ادھیڑ عمر کی حدود پار کی تھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کے کنارے مرجھا گئے تھے۔ اور اب مردنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چھب وہی تھی۔ اکڑ وہی تھی اور باتوں کا تحکمانہ انداز ابھی تک ساتھ دے رہا تھا۔

"مسٹر خالد۔ گیارہ بجے کے بعد آپ کے کمرے میں کسی دوسرے کو نہ ہونا چاہیے۔ ویسے ہم لوگ مہمانوں کی زیادہ آمد و رفت پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کھانا پکانے سے پرہیز کیجیے گا۔ کیوں کہ پیاز کی بدبو سارے گھر میں بس جاتی ہے۔ رہ گیا کرایہ تو وہ آپ ہفتہ وار یا ماہوار جیسے چاہیں دے سکتے ہیں۔"

خالد "میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ جیسا لینڈ لیڈی چاہے گی میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔"

لینڈ لیڈی ہنسی۔ لیکن مسکراہٹ پھیکی اور اجاڑ تھی۔ اس نے کمرے کی چابی خالد کو دیتے ہوئے کہا کہ آپ کمرہ نمبر پانچ میں جا سکتے ہیں۔

نئے کمرے کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ فرش پر سرخ

قالین تھا۔ اور پردے بسکٹ کے رنگ کے تھے۔ جس پر بڑے بڑے نیلے اور سُرخ پھول بنے ہوئے تھے۔ ایک آرام کرسی کے علاوہ دو اور کرسیاں بھی تھیں۔ میز گول مگر خوبصورت تھی۔ وارڈ روب دیوار کے اندر بنا ہوا تھا۔ جس کے ایک چوتھائی حصے میں نل تھا۔ دوسرے میں بجلی کا چولھا اور تیسرے میں کپڑے ٹانگنے کا انتظام۔ وارڈ روب کا دروازہ بند کردیجیے تو سب چیزیں نظروں سے غائب ہو جاتی تھیں۔

آرام کرسی میں بیٹھ کر خالد نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر سوچنے لگا "میرا پڑوسی کون ہے؟ کوئی معقول شکل دیوار کی دوسری طرف رہتی ہو تو پھر اتنا سونا نہیں رہے گا۔"

اتنے میں اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جانے کیا سوچ کر اٹھا۔ بالوں پر جلدی سے کنگھے کا ایک ہاتھ مارا۔ لپک کر دروازہ کھولا تو ایک بڈھا انگریز کھڑا تھا۔

"معاف کرنا بیٹے! میرا نام جان ہے۔ ذرا ماچس دے سکتے ہو؟"

"ضرور۔ بخوشی۔ یہ لیجیے۔"

جان "بات یہ ہے کہ میں آج ہی یہاں آیا ہوں ابھی سامان ٹھیک نہیں کیا ہے۔"

"عجیب اتفاق ہے میں بھی آج ہی آیا ہوں۔" خالد خوش ہو کر بولا۔

"چلیے اچھا ہوا ہم دونوں میں کم از کم ایک چیز تو مشترک نکلی۔"

جان خالد کے اس جملے کے سارے معنی سمجھ گیا۔ وہ خالد کے

ذہنی رجحان کا اندازہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "ایک کیوں بہت سی چیزیں
مشترک نکل آئیں گی۔ تلاش کے بغیر کوئی چیز نہیں ملتی ہے۔"

بڈھا جان ماچس لے کر چلا گیا۔ خالد سوچنے لگا کہ آدمی معقول معلوم ہوتا ہے۔ تھوڑی سی دیر کے بعد جان نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا ماچس واپس کرتے ہوئے پوچھنے لگا "تم کیا کرتے ہو لندن میں!"

خالد: "پڑھنے آیا تھا۔ اب ایک فیکٹری میں ملازم ہوں اور شام کو اسکول جاتا ہوں۔"

جان: "اس کا یہ مطلب ہوا کہ صبح چھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک تم کام کرتے رہتے ہو۔"

خالد: "جی ہاں، مطلب تو یہی ہوا۔"

جان: "تھک نہیں جاتے"

خالد: "کس سے شکایت کروں ــــ جس سے کہوں گا وہ یہی کہے گا کہ پڑھنا چھوڑ دو اور یا پھر نوکری سے استعفیٰ دے دو۔"

جان: "نہیں ایسا نہ کرنا۔ لیکن مزدوری میں جو تھکن ہوتی ہے وہ پڑھے لکھے آدمی کا دل توڑ دیتی ہے۔"

خالد: "اب اس زندگی کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔"

جان: "تمھیں زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے۔ پارٹ ٹائم کام کیوں نہیں کر لیتے۔"

خالد: "میں نے بہت تلاش کیا۔ لیکن عجیب بات ہے، میں جہاں جہاں گیا میرے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے جگہ بھر چکی تھی۔"

جان: "میں جانتا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بات

دراصل یہ ہے کہ ہماری ملکہ معظمہ صرف کرسمس کے دن کامن ویلتھ کے لوگوں کو یاد کرتی ہیں۔ اور وہ بھی ریڈیو کے ذریعے — بہر حال ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا کوئی حل نہیں ہوا کرتا۔ میرا مطلب سرکاری حل نہیں ہوتا۔ ان کو صرف انفرادی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔"

خالد: انفرادی طور پر مسائل اسی وقت حل ہوتے ہیں جب لوگوں میں مل بیٹھ کر ایک دوسرے کے غم اور خوشیاں بانٹنے کی صلاحیت ہو۔"

جان:" بالکل ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ بہرحال بہتر۔ دیکھو میں کوشش کروں گا تمہارے لیے۔ ہو سکتا ہے کہ تم کو پارٹ ٹائم کام دلانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ لیکن مجھے یاد دلاتے رہنا۔"

یہ پہلا انگریز تھا جس نے خالد کے پرابلم کو پہلی ہی ملاقات میں سمجھ لیا تھا۔ دل اچھا ہو تو دل کو دل سے راہ ہو جاتی ہے

"جان تم یقیناً اچھے آدمی ہو" خالد نے اپنے آپ سے کہا۔

سچ مچ اگر جان اسے کہیں پارٹ ٹائم کام دلا دے تو اس کی زندگی سدھر جائے گی، وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکے گا۔ اور پھر ایک دن وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے گا جس کی خاطر وہ اتنا لمبا سفر کر کے لندن آیا ہے۔ لیکن وہ منزل کون سی ہے؟ کیا کوئی ایسی چیز بھی ہوتی ہے جس کا نام منزل ہو؟"

نئی جگہ کی اداسیوں نے خالد کو گھیر لیا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ مسائل کی یورش ہوتی تو مارگریٹ کے تصور میں پناہ ڈھونڈھ لیتا۔ پھر اس نے سوچا کہ کیوں نہ جان سے گپ لڑائی جائے۔

جان کا دروازہ اس نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ دور سے آواز

آئی "اندر آجاؤ" جان اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ کی میز پر بہت خوبصورت ترو تازہ کارنیشن کے سرخ پھول رکھے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک پیاری سی سبک ناک نقشے والی لڑکی فریم میں مسکرا رہی تھی۔ خالد نے پھولوں کو پسند کیا "بڑے خوبصورت پھول ہیں؟"
"تمہیں پسند ہیں تو تم لے لو"

خالد "نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اچھے پھول تو سب ہی کو اچھے لگتے ہیں"

جان "سب ہی کو اچھے نہیں لگتے۔ یہی تو بات ہے۔ اور جسے اچھے لگتے ہوں اسے پھول ضرور قبول کر لینے چاہئیں" جان نے دو تین پھول نکال کر خالد کے ہاتھوں میں دے دیے اور اس سے انکار کرتے نہ بنا

خالد "شکریہ۔ لیکن یہ پھول آپ کس کے لئے لائے تھے؟"

جان "یہ لڑکی جو فریم میں مسکرا رہی ہے یہ میری بیٹی ہیلن ہے۔ بہت سی یادیں وابستہ ہیں اس سے۔ آج ہماری بچی کی سالگرہ کا دن ہے۔ اسے کارنیشن بہت پسند ہیں۔ اس لیے آج کے دن میں یہ تحفہ کبھی نہیں بھولتا"

خالد "تو۔ تو پھر آپ یہاں اکیلے ــ اس اجنبی گھر میں۔

جان "خالد تم کو یہ سن کر تعجب ہوگا، اس گھر میں۔ میں اجنبی نہیں ہوں۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ یہ گھر میرا تھا۔ للی کا تھا اور پھر ہیلن آگئی۔ میری بچی۔ یہاں کی ہر دیوار میں ہمارے قہقہے بسے ہوئے ہیں۔ اور پھر ایک ایک کرکے سب ساتھ چھوڑ گئے۔ چھوٹی چھوٹی یادیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ گرد میں دبتی چلی گئیں۔ اب یہ یادیں بڑے بڑے

مزار بن چکی ہیں۔ ان کو میں سینے سے چپٹا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اب ان کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے۔

خالد: "لیکن جان یہ لینڈ لیڈی تو تم کو پہچانتی ہوگی!"

جان: "نہیں یہ نہیں پہچانتی۔ اور اسی لئے میں یہاں کرایہ دار بن کر آگیا ہوں۔ اگر وہی شخص اس کا مالک ہوتا جس کے ہاتھ میں نے یہ گھر بیچا تھا تو شاید میری ہمت نہ ہوتی اس گھر میں آنے کی۔ یہ لینڈ لیڈی بے چاری کیا جانے۔ اسے کیا معلوم کہ میں کون ہوں"!

خالد کو اپنے چاروں طرف قبرستان کا سناٹا محسوس ہوا۔ کارنیشن کے پھول اسے ایسا لگا جیسے کسی مندر سے پرساد میں ملے ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جان سے پوچھا۔

خالد: "جان ایلین اب کہاں ہے۔ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں رہتی"!

جان: "پہلے نہیں رہتی تھی۔ لیکن اب میرا ساتھ نہیں چھوڑتی"!

جان خلا میں گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ خالد کی طرف دیکھے بغیر اس نے کہنا شروع کیا۔

جان: "خالد مجھے تمہارے دیش کے ہر لڑکے سے پیار ہے۔ ملک کوئی بھی ہو۔ آنکھ کوئی بھی ہو، آنکھوں کی نمی ایک ہوتی ہے دل کے دھڑکنے کی آواز ایک ہوتی ہے۔ خالد یہ بات میں نے بہت بڑی قربانی دے کر سیکھی ہے۔ مجھے کالے رنگ سے نفرت نہیں تھی لیکن میں محبت بھی نہیں کرتا تھا اس رنگ سے۔ ایک بے تعلقی تھی، جس کو ایک ہندوستانی لڑکے نے تعلق سے بدل دیا۔ ہیلن کو جانے کیسے اس

لڑکے سے عشق ہو گیا، میں سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اپنی لڑکی کی شادی ایک ہندوستانی سے کر دینا۔ میری طبیعت نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ کالے داماد کو گھر لانا میں اس تصوّر ہی سے کانپ اٹھتا تھا۔

میں ایک دیوار کی طرح ہیلن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بچی تھی اس نے بغاوت کرنا چاہی تو میں نے قانون کا سہارا لے کر بغاوت کو کچل دیا۔ ماں باپ سے آزادی ۲۱ سال کی عمر میں ملتی ہے۔ وہ صرف ۱۹ سال کی تھی۔ پھر وہ دونوں یہاں سے بھاگ کر اسکاٹ لینڈ چلے گئے۔ کیوں کہ وہاں کا قانون کم عمری میں آزادانہ شادی کی اجازت دیتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم ہو گیا۔ میں اسی رات اپنی کار سے ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔

جان ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے پھولوں کو ترتیب سے رکھا۔ اور پھر کہنے لگا۔

"کاش میں ان کے تعاقب میں نہ نکلتا۔ وہاں میں نے پولیس کی مدد سے دونوں کا پتا لگا لیا۔ ہوٹل پر جب پولیس نے چھاپا مارا تو ہیلن زار و قطار رو رہی تھی۔ اور کرشن کو اس طرح پکڑے تھی، جیسے دنیا کی کوئی طاقت اُسے الگ نہیں کر سکتی۔

لڑکے پر جھوٹے الزامات لگا کر میں نے اسے قید کرا دیا۔ ہیلن تڑپتی رہی۔ لیکن میرا کچھ نہ کر سکی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ بچی ہے ٹھیک ہو جائے گی — فائدہ اس نے مجھے اس کے لیے زندگی بھر معاف نہ کیا۔ مرتے وقت تک میں اس کی نگاہوں میں مجرم تھا۔ بلکہ شاید

قاتل بھی تھا۔"

خالد کو ایسا لگا کہ جیسے وہ خود اس کہانی کا کردار ہو۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیلن اور کرشن کو وہ ہمیشہ ہمیشہ سے جانتا ہو۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"جان۔ تباہی کے راستوں کی رہبری ہمیشہ جذبات ہی کرتے چلے آئے ہیں۔"

جان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "تمھارا خیال غلط ہے خالد۔ جذبات زندگی میں رنگ بھرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے آدم سے خوش ہو کر اسے نیچے بھیجا تھا۔ فرشتوں کی غلامانہ سعادت مندی سے بور ہو کر اس نے ایک نئی دنیا بسانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہرکیف ہمارے گھر کا حادثہ اس وجہ سے ہوا کہ میں جذبات کے عاری تھا۔ پتھر تھا۔

ہیلن نے اخباروں کو بیان دیا کہ اس نے کرشن کو بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن قانون کی نظر میں نابالغ تو نابالغ ہی ہوتا ہے۔ لندن کی ایک بڑی سی کمپنی میں، میں نے ہیلن کو ایک اچھی سی نوکری دلا دی۔ لیکن اس کا دل نہ لگا۔ تمھارے دیس کے ایک لڑکے نے اسے جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کو دوبارہ زمین میں لگا دیجیے تو وہ نئے سرے سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن بڑے بڑے درخت ایک دفعہ اکھڑ جائیں تو ان کی جڑیں اپنی گرفت کھو دیتی ہیں۔ وہ اداس کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ پھر اس کا وزن کم ہونا شروع ہو گیا۔ دو تین دفعہ وہ مجھ سے چھپ کر جیل

میں کرشن سے ملنے بھی گئی۔ جہاں دونوں نے شادی کرنے کی قسمیں کھائیں۔ وہ دو سال کیا دو سو سال انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔"

"اب سوچتا ہوں کرشن لاکھوں میں ایک لڑکا تھا۔ اس نے جیل میں بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ رہائی پاتے ہی اس نے دو سال کے اندر اندر بی۔ایس۔سی پاس کر لیا۔ لیکن میرے دل میں نفرت کا جذبہ بدستور قائم رہا۔ میں اس شادی کا ہمیشہ مخالف رہا۔ امتحان پاس کرنے سے ڈگریاں ضرور مل جاتی ہیں۔ لیکن کھال کا رنگ نہیں بدلتا۔ ہیلن جب ۲۱ سال کی ہو گئی۔ تو اس نے مجھ سے، اپنے فرعون باپ سے قطع تعلق کا فیصلہ کیا۔ اب قانون اس کی طرف تھا اور میں سوائے سمجھانے کے کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی شادی کی تاریخ مقرر کر لی۔

ہیلن کی ساری شوخیاں، ساری رنگینیاں ساری زندگی واپس آ گئی۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ کرشن کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ رات گزر گئی وہ نہیں آیا۔ صبح کے کوئی چھ بجے ہوں گے۔ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ میں حیران تھا کہ ابھی تو دن کی روشنی بھی نہیں پھوٹی ہے۔ ایسے میں کون آیا ہے؟ ایک پولیس کا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ جو میری لڑکی کی تھی۔ پولیس والا میری لڑکی سے ملنا چاہتا تھا۔ میں ہیلن کو بلا کر لایا تو جانے کیسے اسے خطرے کا احساس ہو گیا۔ لیکن وہ سمجھی کہ میں نے پھر کوئی ترکیب چلی ہے۔ وہ غصّے سے کانپتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی آخر تم کب ہمارا پیچھا چھوڑو گے۔ تمھیں ترس نہیں آتا۔

تمہاری لڑکی مُردوں کی طرح زندہ ہے۔"

پولیس والے نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جیب سے فوٹو نکال کر ہیلن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھنے لگا "یہ تصویر آپ نے کس کو دی تھی؟"

ہیلن: "ہاں۔ ہاں میں نے کرشن کو دی تھی۔ کیا ہوا۔ وہ ٹھیک تو ہے۔" ہیلن کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون کسی نے کھینچ لیا ہو۔

پولیس والا: "موٹر سائیکل کی سواری کوئی اچھی سواری نہیں ہے۔ کل رات کرشن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں کی کوشش کے باوجود ہم اُسے بچا نہ سکے۔"

ہیلن نے اپنے نچلے ہونٹ کے ایک کونے کو اتنی زور سے اپنے دانتوں سے دبایا کہ گوشت کی ایک بوٹی اس کے منہ میں آ گئی۔ وہ چیخی۔ پھر اس کے بعد نہ وہ رو سکی۔ لوگ پاگل پن میں بے طرح ہنستے ہیں وہ ہنس بھی نہ سکی۔

میرے راستے کا کانٹا اب ہٹ چکا تھا۔ کرشن اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ ہیلن میرے لیے پہلے بھی سب کچھ تھی اب تو اور زیادہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ لیکن ہیلن کی خاموشی نہ ٹوٹ سکی۔

کرشن کا بُت بڑا ہوتا گیا۔ اپنی جسامت سے بھی بڑا ہو گیا بڑھتے اور پھیلتے ہوئے وہ میرے دل و دماغ پر حاوی ہوتا گیا۔ میں ہیلن کو لے کر، لیک ڈسٹرکٹ، چلا گیا۔ اونچے اونچے پہاڑوں

کے بیچ ٹھہری ہوئی نیلی جھیل میں بھاگتی ہوئی کشتیاں اس کا جی نہ بہلا سکیں۔ کارنیشن کے سرخ پھول لیے وہ جھیل کے کنارے بیٹھی رہتی۔ رات کو چونک کر اٹھتی۔ کارنیشن کے پھول ہاتھ میں لے کر کھڑکیاں کھول دیتی۔ گہری جھیل کی سطح پر صرف چند روشنیاں بھاگتی نظر آتیں اور بس۔
لیکن مجھے اپنی غلطی کا احساس ہیلن کا آخری خط پڑھ کر ہوا۔ جو اس نے مرنے سے کچھ پہلے لکھا تھا۔"
جان نے بڑے تھکے ہوئے انداز میں تصویر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس کا بڑھاپا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے کئی دفعہ فریم کھولنے کی کوشش کی۔ اور جب اس کے ہاتھ لرزنے لگے تو اس نے فریم خالد کی طرف بڑھا دیا۔ تصویر کے نیچے ایک خط رکھا تھا۔ اس نے خاموشی سے یہ خط خالد کے حوالے کر دیا۔

پیارے ڈیڈ

"صبح میں نہ ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ دُکھ سے تمہاری عمر دوگنی معلوم ہونے لگے گی۔ میں بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کرشن کے بغیر میرا وجود بیکار ہے۔ دل میں اب بھی اس آخری ملنے کا جانے کیوں خیال آتا ہے۔

دو سال پہلے اگر تم نے شادی کی اجازت دے دی ہوتی تو شاید کرشن آج زندہ ہوتا۔ اور شاید میں بھی اپنی طبعی موت مرتی۔

ڈیڈ میری موت کو اخبار کی خبر نہ بننے دینا۔ اپنی

ہیلن کی یہ آخری خواہش تو پوری کردو گے نا ۔
تمہاری
ہیلن

" ہیلن خواب آور گولیاں کھا کر ایسا لیٹی کہ پھر کبھی نہ اٹھی ۔ مجھے معافی تک مانگنے کی مہلت نہ دی اس نے "

لیمپ کی روشنی میں جان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں ۔ وہ بڑی دیر تک چھت کو گھورتا رہا ۔ پھر کہنے لگا ۔

" اس کی موت نے میرے ذہن کے سارے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ لیکن خالد وقت کے مطالبات کچھ اور ہی ہوتے ہیں ۔ وہ ہر چیز کو ہر آدمی کو جگہ خالی کرنے کے لیے کہتا ہے ۔ تاکہ کوئی دوسرا شخص کوئی دوسرا لمحہ وہاں گزر سکے ۔ اور کسی دوسرے دل کی دھڑکن وہاں سنائی دے سکے ۔ خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے ، اس کی تخلیقی فیکٹری کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا "

خالد اپنے خیالات میں گم ۔ خاموش بیٹھا رہا ۔ اس کی نظریں ہیلن کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں ۔ بڈھے جان نے خط کو موڑا ، اور تصویر کے پیچھے رکھ کر فریم کسنے لگا ۔ خالد سوچ رہا تھا ۔

" میر حبیب ہیلن کا روپ دھار کر آتی ہے تو ہماری قدامت پسند آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں ۔ مشرقی محبت کی کہانیوں اور یورپین ہیلن کی اس آپ بیتی کو اگر ایک ہی ترازو کے مختلف پلڑوں میں رکھا جائے تو کون سا حصہ جھک جائے گا "

●

گڈ مارننگ سے گڈ ایوننگ تک

خالد جانے کیوں جان اور ہیلن کو بھول کر ساری رات کرشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ پردیس کی موت کیسی بھیانک ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ پردیس میں چتا سلگتی ہے بھڑکتی نہیں۔ اس انتظار میں کہ شاید کوئی عزیز کوئی رشتے دار آ جائے۔ ایسی موت ماں باپ کو بے موت نگل لیتی ہے۔

صبح جب وہ فیکٹری جانے کے لیے نکلا تو اُسے پتا چلا کہ اِسی گھر میں ایک لڑکی بھی رہتی ہے۔ زینے پر دونوں کی ایک لمحے کے لیے ملاقات ہوئی۔ خالد کے منہ سے "گڈ مارننگ" نکل گیا۔ جس کا جواب بہت روکھے انداز میں "مارننگ" ملا۔

لڑکی کے چہرے پر نہ تو تعجب تھا اور نہ خوشی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "آیندہ سلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے"!

نیچے میز پر وہ اپنی ڈاک دیکھنے لگی۔ خالد نے بھی ایک نظر خطوں پر ڈالی پھر اُسے خیال آیا کہ ابھی تو کسی کو اس کا پتا بھی نہ معلوم ہوگا۔

خالد کے ذہن میں لڑکی کا روکھا پن کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ لیکن چمن میں رہنے کے لیے کانٹوں سے نبھانا ہی پڑے گا۔

خالد: "غالباً صبح سلام کرنے کی آپ کو عادت نہیں ہے۔"
لڑکی: "مجھے ان سلاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں آپ کے سلام کا جواب دے چکی ہوں۔"
خالد: "جیسے سلاٹ مشین ٹکٹ دے دیتی ہے۔"
لڑکی: "تو پھر اور کیسے جواب دوں۔ ناچنا شروع کر دوں مارے خوشی کے۔"
خالد: "بعض لڑکیوں کو کالے لوگوں کے سلام اچھے نہیں لگتے۔"
لڑکی: "تم لوگوں کا وہم ہر بات کو رنگ دیتا ہے۔ یہ رنگ کا مسئلہ نہیں ہے سمجھے۔ مجھے یہ سلام اس وجہ سے اچھے نہیں لگتے ہیں کہ یہ عام طور پر گڈ مارننگ سے شروع ہو کر گڈ نائٹ تک پہنچ جاتے ہیں۔"
خالد کو لڑکی کا غصہ بڑا پیارا لگا۔ اور اس کی بات اس سے بھی زیادہ پیاری۔ وہ فیکٹری پہنچ کر بھی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور شام کو جب وہ آنند سے ملا تو اس نے سارا قصہ سنا ڈالا۔ آنند بہت زور سے ہنسا پھر کہنے لگا "گھر بدلتے ہو۔"
خالد: "کرایہ زیادہ دینا پڑے گا۔"
آنند: "جن لوگوں کو تیز مرچ کھانا اچھی لگتی ہیں وہ ڈاکٹروں کی ہدایات کے باوجود کھاتے ہیں ــــ ویسے خالد ایسی لڑکیوں کے پاس عام طور پر درد مند دل ہوتا ہے۔ یہ خفگی بڑی پُرخلوص ہوتی ہے۔"
آنند حسب دستور موڈ میں تھا وہ خالد کو سمجھاتا رہا۔

آنند: "نیت صاف رکھو پھر کسی لڑکی سے ڈر نہیں لگے گا۔ اور پھر پڑوسن سے پیار کرنے کی بات تو بائبل میں بھی آئی ہے"

خالد: "چھوڑو یار اس سبق کو اور گولی مارو اس لڑکی کو"

دیر رات گئے خالد، زمین دوز اسٹیشن کے بجلی سے چلنے والے زینے پر کھڑا اوپر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے آگے ایک خوبصورت لڑکی کالا اوور کوٹ پہنے اور ایک خوبصورت اسکارف سر پر باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ رومال کے باہر نکلی ہوئی لٹیں بتا رہی تھیں کہ بال بھورے ہیں۔ لڑکی نے مڑ کر خالد کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لیے نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی۔ اور پھر اپنے پرس میں کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔

"وہ یقیناً مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی" خالد نے اپنے شبے کو یقین سے بدلنے کی کوشش کی۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ غوطے کھا گیا۔ جانے کیسے کیسے خیالات کا ایک ریلا آیا۔ پھر ہمت کر کے اس نے لڑکی سے کہا "آج موسم بہت خوشگوار ہے"

لڑکی "جی ہاں، برا نہیں ہے موسم"

بھاگتا ہوا زینہ اوپر پہنچ گیا۔ خالد کو ٹھنڈی ہوا جو لگی تو سرد آ گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

"یہ اسکاچ وسکی کا نشہ دیر میں کیوں چڑھتا ہے"

دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے۔ آخر ایک موڑ پر دو چار قدم تیزی سے بڑھا کر خالد اس کے ساتھ آ گیا۔ اس کا

نشہ بولا۔

"آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں اس لباس میں اور اس کالے رومال کے درمیان آپ کا چہرہ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے بادلوں میں سے چاند نکل آیا ہو۔ یا پھر جیسے کوئی تروتازہ گلاب کا پھول جھانک رہا ہو۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ بدستور ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ خاموشی پھیلنے لگی۔ خالد کو ڈر لگا کہ کہیں باتوں کا سلسلہ بالکل ہی ٹوٹ نہ جائے۔ اس نے ایک اور کوشش کی "اس وقت آپ کسی پارٹی سے آرہی ہیں۔"

"جی ہاں میری ایک سہیلی کی سالگرہ تھی۔"

خالد نے اپنے سینے پر کراس بنائی۔ پھر کہنے لگا۔

"شکر ہے۔ آپ بولیں تو۔ ویسے لڑکیوں کے سالگرہ منانے کا میں بہت مخالف ہوں۔"

"وہ کس لیے" لڑکی نے دلچسپی لی۔

"وہ اس لیے کہ ان کی عمر ایک سال بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ کوئی خوشی کی بات تو ہے نہیں۔"

"عمر بڑھ جاتی ہو گی لیکن کیک پر موم بتیاں لگاتے وقت لڑکیاں عام طور پر گنتی بھول جاتی ہیں۔"

خالد بہت زور سے ہنسا۔ اس کا قہقہہ بے تکا تھا۔

"جب تک موم بتیاں اتنی ڈھیر ساری نہ ہوں کہ ان کی قیمت کیک سے زیادہ ہو جائے اس وقت تک سالگرہ منانا چاہیے۔"

لڑکی نے چوٹ کی "تو آپ کسی ایسی ہی سالگرہ سے آئے ہیں"
خالد: ہاں ہم پردیسی لوگ اپنی تنہائی کی سالگرہ منا رہے تھے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا اچھی اچھی باتیں کر رہا تھا۔ پھر جانے کیوں طبیعت اچاٹ ہو گئی اور اپنا کمرہ یاد آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ وہ بے چاری بھی انتظار کر رہی ہو گی"

لڑکی نے چونک کر پوچھا "کون انتظار کر رہی ہو گی؟"
"تنہائی!" خالد نے آہستہ سے لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، لیکن اس نے گھبرا کر ہاتھ چھڑا لیا اور دور ہٹ کر چلنے لگی۔ لیکن وہ خفا نہیں تھی۔

خالد: ہمارے ایک بہت مقبول شاعر نے لکھا ہے کہ اگر تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں آجائے تو راستے کے سارے چراغ جل اٹھیں گے۔ اور آپ یقین کیجیے۔ اس شاعر نے کسی آپ ہی جیسی لڑکی کے لیے یہ بات لکھی تھی"

لڑکی مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی "دور چلنے میں ٹکرانے کے امکانات کم ہوتے ہیں"

خالد "آپ کو دور ہٹ کر چلنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں اہنسا کے دیش کا رہنے والا ہوں۔ رشیوں اور سادھوؤں کے ملک سے آیا ہوں ۔۔۔ اچھا آپ خود بتائیے۔ آپ کتنا فاصلہ رکھ کر چلنا چاہتی ہیں۔ میں اس سے اگر ایک انچ بھی آگے بڑھوں تو ...... تو سزا آپ تجویز کر لیجیے گا"

لڑکی تھوڑی دیر تک خالد کو غور سے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر

کہنے لگی "میرا خیال ہے بارہ انچ کا فاصلہ کافی ہو گا"

دونوں نے ایک دبا دبا قہقہہ لگایا۔ اور پھر دونوں کے قدم ایک ساتھ اٹھنے لگے۔ خالد کہنے لگا۔

"یہ فاصلہ بہت مناسب ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اتنی قربت فرو ہو کر آنکھ اور کان کے علاوہ ناک بھی استعمال ہو سکتی ہو"

لڑکی موڈ میں تھی "ناک تو کہیں بھی رگڑی جا سکتی ہے"

"یہ بات نہیں ہے۔ لڑکیوں میں ایک عجیب دغریب بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے۔ جس کی زد میں آکر بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اور مجھے بچنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"

خالد کی نظر اٹھی تو وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ لڑکی بھی رک گئی۔ خالد کے دماغ نے ٹھوکر کھائی، لیکن پھر سنبھل گیا۔

"آپ کو کبھی اکیلا پن محسوس ہوتا ہے"

لڑکی "اپنے گھر میں کوئی تنہائی محسوس نہیں کرتا"

"یہی تو رونا ہے۔ بعض لوگ بھرے پُرے گھروں میں، مجموں میں بھی تنہا ہوتے ہیں۔ یہ زندگی ایک قید کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قید تنہائی۔ میرا اکثر جی چاہتا ہے کہ میں اپنے وجود کو چپکے سے کہیں رکھ کر بھول جاؤں۔ جیسے لوگ چھتری بھول جاتے ہیں۔ مگر مشکل کیا ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے شراب بھی ساتھ نہیں دیتی۔ ہوش جو ہے نا وہ گرتا پڑتا لنگڑاتا ہوا ساتھ دیتا ہی رہتا ہے"

لڑکی: "شراب اگر آپ کسی مسئلہ کے حل کی تلاش کے سلسلے

میں جیتے ہیں تو بہتر یہی ہوگا کہ چھوڑ دیجیے یہ"

خالد: "چھوٹی چھوٹی برائیاں آدمی کو کرتے رہنا چاہیے"

لڑکی: "تاکہ بڑی برائیوں سے بچا رہے"

خالد اور وہ، اجنبی لڑکی۔ اندھیری رات میں، لیمپ پوسٹ کے نیچے بڑی دیر تک کھڑے باتیں کرتے رہے۔ خالد نے کئی دفعہ سوچا کہ یہ لڑکی جاتی کیوں نہیں ہے۔ اس کا کوئی قدم آگے اٹھے تو میں بھی اپنے گھر کی طرف بڑھوں پھر ایک دم اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ اسے اوپر آنے کی دعوت دی جائے۔

لڑکی بدستور کھڑی باتیں کرتی رہی۔ بات سے بات نکال کر بات بڑھاتی رہی۔ خالد کے جملوں میں نیا پن تھا جو عام طور پر انگریز لڑکوں کی گفتگو میں نظر نہیں آتا ہے۔ شاید اسی لیے وہ ابھی جانے کے تیار نہیں ہے۔ جب کچھ اور وقت گزر گیا تو خالد کہنے لگا "اگر مجھے صبح فیکٹری نہ جانا ہوتا تو میں صبح تک آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ آپ کی ہلکی پھلکی پیاری پیاری باتیں۔ آپ کی ہنسی۔ آپ کی مسکراہٹ مجھے پسند ہے آپ کا ہر قہقہہ مجھ سے کہتا ہے۔ جانتی ہیں کیا کہتا ہے"

"کوئی بے تکی بات کہتا ہوگا"

"کہتا ہے کہ زندگی سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے — سنیے آپ سے پھر کب ملاقات ہو سکتی ہے"

لڑکی مسکرائی "ہم روز مل سکتے ہیں"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھیے میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔ میری قسمت اتنی اچھی نہیں ہے۔ اچھا تو بتائیے کل کتنے بجے ہم لوگ

کہاں ملیں گے "
"پکیڈلی کے اسٹیشن پر"
"دیکھیے ایک بات اور ہے ۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اتنی جلدی فیصلہ نہ کیجیے ۔ پہلے گھر جا کر سوچ لیجیے کہ آیا آپ کو ایک اجنبی سے ملنا چاہیے یا نہیں ۔ آپ یقین کیجیے اگر کل آپ اسٹیشن پر نہیں آئیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی ۔ دکھ ضرور ہوگا ۔ مگر دکھ تو ایک بجی چیز ہے ، دکھ کا کیا وہ تو بات بے بات ہوتا رہتا ہے آپ کہاں رہتی ہیں چلیے میں پہنچا دوں "
لڑکی سے ہنسی ضبط نہ ہوئی ۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا ۔
" آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود چلی جاؤں گی "
خالد " سنیے ، اندھیرا بہت ہو گیا ہے ۔ ایک لمحے کے لیے اپنا ہاتھ دے دیجیے تو یہ تاریکی چھٹ جائے گی ۔ رخصت ہونے سے پہلے یہ چھوٹی سی قربانی تو آپ کر ہی سکتی ہیں "
لڑکی نے اپنے پرس سے چابی نکالی " لیکن رخصت ہونے سے پہلے میں چاہتی ہوں کہ آپ کو گھر تک پہنچا دوں " اس نے صدر دروازہ کھول کر خالد سے کہا ۔
" چلیے اندر ۔ یہاں کافی سردی ہے ۔"
خالد کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی ۔ پھر جیسے اس کو کوئی بھولی بسری شکل یاد آگئی اس نے لپک کر لڑکی کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے ۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ۔ پھر اس کے سر سے ریشمی اسکارف ہٹا کر کہنے لگا ۔

"تو آپ ہیں گڈ مارننگ"

"جی ہاں میں ہوں۔ گڈ مارننگ"

دونوں ہنستے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔ پہلی منزل پر دونوں کے کمرے آمنے سامنے تھے۔ اور ان دونوں کے بیچ میں جان کی یادوں کا مزار۔

اپنے اپنے دروازوں کے پاس کھڑے ہو کر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر خالد آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اس نے بہت پیار سے پھول کی طرح لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم گرم ہونٹ ثبت کر دیے۔ پھر سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگا "نام کیا ہے آپ کا؟"

"بار برا"

"بار برا تم بہت خوبصورت ہو۔ تمھاری آنکھیں اور تمھارے ہونٹ کتنے مکمل ہیں۔ جیسے خدا نے نہیں مائیکل انجلو نے تراشے ہوں؟"

خالد نے بار برا کے چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور بڑی بڑی پلکیں گالوں پر بچھی ہوئی تھیں۔ خالد نے ڈوبتی ہوئی آواز میں وظیفہ پڑھا۔ "بار برا — بارب"

بار برا کی لمبی پلکیں بڑے احترام سے اوپر اٹھ گئیں — خالد کہنے لگا "نیلی آنکھیں کہتی ہیں کہ مجھ سے محبت کرو نہیں تو میں مرجاؤں گی۔ لیکن تمھاری کالی آنکھیں جانتی ہو مجھ سے

کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ کہہ رہی ہیں کہ مجھ سے محبت کرو نہیں تو میں تم کو مار دوں گی "

بار برا کے ہونٹ اور آنکھیں مسکرا اٹھیں۔ خالد نے آہستہ سے بڑھ کر اپنے ہونٹ بار برا کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ وہ دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے کو خدا حافظ نہ کہہ سکے۔

"اب مجھے چلنا چاہیئے " بار برا کو ہوش آیا تو وہ خالد کی باہوں سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے مڑی۔ خالد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"اچھا بار برا پھر ملیں گے۔ گڈ نائٹ "

خالد ابھی اپنے دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ بار برا نے لپک کر اس کو روکا "

"خالد یاد ہے میں نے صبح تم سے کہا تھا۔ یہ سلام عام طور پر گڈ مارننگ سے شروع ہو کر گڈ نائٹ تک پہنچ جاتے ہیں "

●

فرانسیسی پکنک

صبح بہت دیر سے ہوئی

خالد بستر میں لیٹے لیٹے رات کے واقعات کی کڑیاں جوڑتا رہا۔ کل کا دن اس کی زندگی کا سب سے زیادہ خوشگوار دن تھا۔ جوں جوں واقعات کی کڑیاں ملتی گئیں اس کی حیرت بڑھتی چلی گئی۔ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ تصور میں پھول کھلتے چلے گئے۔

آج وہ باربرا سے پھر ملے گا۔ اُسے کسی بہت بڑے رستوراں میں کھانے کی دعوت دے گا۔ رات کو کرسے پر اس کے ساتھ رقص کرے گا۔ رقص کے لیے ان دونوں کا قد آئیڈیل تھا۔ باربرا اُس سے صرف چار انچ چھوٹی تھی۔ اس کی پیشانی خالد کے ہونٹوں تک پہنچتی تھی اور ہونٹ سے ہونٹ ملانے کے لیے اُسے صرف اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ پنجوں کے بل کھڑے ہوکر ناممکنات کو ممکنات بنانے کی کوشش کرنے والی لڑکی کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ اگر باربرا چاہے تو اُسے زندگی کا وہ تجربہ دے سکتی ہے جو خالد کو آج تک حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ یہی تو وہ لمحہ ہوتا ہے جب کوئی

عورت کسی مرد کے ذہن پر اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر سکتی ہے۔ اور یہ لمحہ زندگی میں صرف ایک بار آتا ہے۔

باربرا بے وقوف نہیں نکلی۔ خالد کی زندگی کے سرورق پر اس نے اپنا نام جلی حروف میں لکھ دیا۔ یہ دونوں پہلے تو اپوائنٹ منٹ کرکے ملتے رہے۔ پھر دروازہ کھٹکھٹائے بغیر ملتے رہے اور اس کے بعد سارے دروازے بیچ سے ہٹ گئے۔ روز کی ملاقات عادت اور جدائی الجھن بن گئی۔

بڈھا جان ان دونوں کو چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ دونوں کو ساتھ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اٹھتیں۔ خالد کے روپ میں اسے کرشن نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے سے کہتا۔

"میں ان دو معصوم ہستیوں کو کبھی الگ نہ ہونے دوں گا"

بڈھا جان دل ہی دل میں سلامتی کی دعائیں مانگتا۔ "اے مسیح تیرے دل میں دنیا کا درد ہے۔ لیکن انفرادی غموں کا بھی کوئی مداوا ہے تیرے پاس ــــ، باربرا اور خالد میرے بچے ہیں۔ تو ایک دفعہ میرے بچوں کو چھین چکا ہے۔ لیکن اب اگر ان بچوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تیرے در پر کبھی سر نہ جھکاؤں گا"

باربرا کو خالد کی دوستی سے کچھ غیر معمولی سکون ملا ــــ اسے ایسا لگا کہ جیسے یہی وہ لڑکا ہے جس کے سوتے جاگتے خواب دیکھے تھے۔ جس کے بارے میں جانے کتنا سوچا تھا ــــ تصویریں بنائی تھیں۔ پوجا کی تھیں اور زندگی کا سب کچھ تھا اور

کر دینے کی تمنا کی تھی۔

دونوں کی راتیں ساتھ گزرنے لگیں۔ وہ ایک بستر میں ایک پیالی سے چائے پینے لگے۔ ایک چمچے سے ناشتہ کرنے اور ایک گلاس سے پانی پینے لگے۔ خالد کو زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ گھر میں عورت کی موجودگی کتنی دلکش ہو سکتی ہے یہ عورت ماں سے بھی زیادہ اہم اور بہن سے بھی زیادہ قریب ہو سکتی ہے۔ باربرا اس کی زندگی کا ایک جز بن کر اس کے وجود پر چھا گئی۔

جمعہ کی رات تھی۔ ہفتہ اور اتوار چھٹی کے دن ہوتے ہیں باربرا نے کروٹ لی اور پھر کہنے لگی "کیوں نہ ہم لوگ کل فرنچ پک نک منائیں"

خالد "ہاں ضرور چلو۔ کل کچھ سینڈوچ وغیرہ بنا لو۔ صبح صبح نکل چلیں گے"

باربرا بڑے زور سے ہنسی "فرنچ پک نک میں گھر کے اندر رہنا ضروری ہوتا ہے"

خالد سوالیہ نشان بنا ہوا تھا "گھر کے اندر رہنا ضروری ہوتا ہے؟"

باربرا "فرنچ کا لفظ ان تمام جگہوں پر استعمال کیا جاتا ہے —

— جہاں آپ روایات کو توڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ فرنچ پک نک گھر میں بیٹھ کر دروازے بند کر کے منائی جاتی ہے"

خالد "بہت دلچسپ بات ہے۔ ہاں تو پھر آگے کیا ہوتا ہے۔"

باربرا "ہم لوگ دو دن کی ضروریات کی تمام چیزیں کمرے میں رکھ کر ۴۸ گھنٹے کے لیے دروازہ بند کر دیں گے۔ دنیا سے دنیاوی ضرورتوں سے، دنیاوی لوازمات سے اور سماج سے الگ ہو کر فطری زندگی گزاریں گے۔ اور اس کے لیے پیدائشی لباس زیب تن کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

خالد "پیدائشی لباس!"

باربرا "جب تم پیدا ہوئے تھے تو کون سا لباس پہنے تھے۔"

خالد "سمجھ گیا! سمجھ گیا!! لیکن کیا مزا آئے گا اس میں۔"

باربرا "کیوں میں تو سمجھتی ہوں کہ کافی دلچسپ طریقہ ہے پک نک منانے کا۔ اور پھر ایک بالکل نیا تجربہ کرنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ دیکھو نا ایسی پک نک کے قصے ناولوں میں پڑھتے چلے آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ناولوں کے ان صفحات کو زندگی کا آئینہ بنا دیں۔"

خالد "مجھے تو اعتراض ہے۔"

باربرا "آخر تمھیں کس بات پر اعتراض ہے۔"

خالد "مجھے اس کی مدت پر اعتراض ہے۔"

باربرا "مدت کے لیے رونے کی ضرورت نہیں ہے ہم چوبیس گھنٹے نہیں تو بارہ گھنٹے میں ختم کر دیں گے۔"

خالد "ارے یہ بات نہیں ہے۔ یہ اڑتالیس کا ہندسہ جو

ہے یہ ہندوستانی علم جوتش کے حساب سے بہت منحوس ہوتا ہے۔ اس مدت کو ۲۰ گھنٹے کیوں نہیں کر دیتیں "

باربرا نے خالد کی آنکھوں میں شرارت دیکھ لی تھی وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی "گرؤ! میں ہار گئی"

خالد کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے "باربرا میں تمہارے ساتھ ساری زندگی ایک کمرے میں گزار سکتا ہوں " لیکن خالد یہ دعویٰ کر نہ سکا۔

خالد: "باربرا پک نک کی مدت کم سے کم بارہ گھنٹے بڑھائی جا سکتی ہے "

باربرا "وہ کیسے "

خالد: "کیوں نہ یہ پک نک ابھی شروع کر دی جائے تھوڑی مشق چاہیے نہیں تو جب دن کا اجالا پھیل جائے گا میری نظریں تمہاری طرف اٹھ نہ سکیں گی "

باربرا کچھ سوچتے ہوئے بولی "خالد تم ٹھیک کہتے ہو۔ روایات کو توڑنے کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے "

۴۸ گھنٹے کی پک نک باربرا اور خالد کو جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا قریب لے آئی کہ پھر وہ ایک جان اور دو قالب ہو گئے۔ بعض لوگ ہوتے ہیں جن کو جتنا قریب سے دیکھیے وہ اتنے ہی زیادہ اچھے لگنے لگتے ہیں۔ باربرا خالد کو کچھ ایسا ہی سمجھنے لگی تھی۔ باربرا کو پچھلے ۲۱ سال میں اتنا پیار نہیں ملا تھا جتنا اسے ان ۴۸ گھنٹوں میں مل گیا۔ زندگی اگر اسی کا نام ہے تو پھر وہ جنت سے بھی اس کا

سودا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

باہر پالا گر رہا تھا۔ سڑکوں پر کبھی کبھی کسی کے تیز قدموں کی آواز ابھرتی پھر ڈوب جاتی۔ اِکّا دُکّا لوگ اوورکوٹ کے کالروں میں گردن سمیٹے چلے جا رہے تھے۔ بھاگتی ہوئی کاروں کی سرخ بتیاں عفریت کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کمرے کے اندر آتشدان کی آگ تیز تھی۔ اور شعلوں کی لمبی لمبی زبانیں چمنی کی طرف ایسے لپک رہی تھیں۔ جیسے اوپر جلنے کے لیے بے تاب ہوں۔ جلتی ہوئی لکڑیاں چٹخ رہی تھیں اور کبھی کبھی کوئی چنگاری بغاوت کر کے سرحد پار آ جاتی۔

سلگتی ہوئی اسی آگ کے سامنے خالد باربرا کے سینے پر سر رکھے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس پر نیم خوابی کی کیفیت طاری تھی۔ باربرا اس کے بالوں کی خوشبو میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی لمبی اور خوبصورت انگلیاں خالد کی ننگی پیٹھ پر آہستہ آہستہ رقص کر رہی تھیں۔ پھر وہ دبی دبی آواز میں کہنے لگی "خالد"

"ڈارلنگ" خالد نے اپنے جاگنے کا ثبوت دیا۔

"خالد میں سوچتی ہوں کہ یہ گزرتا ہوا لمحہ بس اسی طرح روک دیا جاتا۔ زندگی بس اسی کیفیت کا نام ہوتا۔ اسی رفتار کا نام ہوتا تو پھر زندہ رہنے کو جی چاہتا"

خالد: "اور پھر میں شاید پاگل ہو جاتا۔ یہ جمود یہ ٹھہراؤ بس پک نک کے لیے مناسب ہے اس کے بعد تو یہ گلا گھونٹ دے گا"

باربرا: "مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے"

خالد: "میں اتنا ڈراؤنا ہوں؟" خالد اٹھ کر بیٹھ گیا۔
بار برا: "مجھے تم سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔ محبت میں مطالبے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ اور مجھے مطالبوں سے نفرت ہے، چاہے وہ میرے ہی کیوں نہ ہوں۔ خالد تم نے کبھی محبت کی ہے؟"
خالد: "ہاں کی ہے۔"
بار برا: "کس سے۔ کب؟"
خالد: "یہاں سے بہت دور اپنے دیش میں کی تھی۔ بس ایک دفعہ محبت کی تھی۔ ہماری شادی نہ ہو سکی۔ لیکن اب بھی وہ لڑکی ایک چھبن بن کر مجھ میں سما گئی ہے۔ ہر ذہن اپنی پہلی محبت کی طرف بھاگتا ہے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ میں کسی دوسری لڑکی کے ساتھ جذبات کی لہروں میں بہہ گیا ہوں اور وہاں یہ لڑکی۔ میری پہلی محبت ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔
بار برا: "اچھا ہی ہوا کہ شادی نہ ہو سکی ورنہ یہ سہارا بھی نہ رہتا۔ یہ حسین یادیں بھی چھن گئی ہوتیں۔"
لندن میں پہلی دفعہ خالد کے زخم ہرے ہو گئے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ماضی کو حال اور مستقبل سے زیادہ درخشاں پایا۔ بار برا اس کہانی کی مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے ذہن میں ایک سوال کچوکے لگا رہا تھا۔ آخر جب ضبط نے جواب دیا تو وہ کہنے لگی "اس لڑکی سے تمھاری شادی کیوں نہ ہو سکی؟"
خالد: "یہ بات آج بھی میرے لیے معمہ ہے۔ اس لڑکی کی

ممی مجھے بے انتہا پسند کرتی تھیں۔ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر ممی کو ایک عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ جس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ان کے چہرے کو دیکھنا کافی تھا۔ میرے دوستوں کا اور خود میرا خیال تھا کہ ممی جب سنیں گی کہ میں ان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ممی نے جب میری اس خواہش کی خبر سنی تو ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ انھوں نے شادی کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اب ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ میں ممی کی عزت کرتا تھا۔ محبت کرتا تھا۔ مجھے اس تبدیلی سے ایسا صدمہ پہنچا کہ میں نے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن اس لڑکی نے احتجاج کیوں نہیں کیا" بار بار اپنے لڑکی کے کیریکٹر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"ہمارے ملک کے ایک مہذب متوسط گھرانے کی لڑکی جو کچھ کر سکتی ہے اس نے کیا۔ زہر کھانے کی دھمکی دی۔ روئی پیٹی۔ گھر سے بھاگ نکلی۔ لیکن۔ ہمارے یہاں سماج کے ناخن۔ بہت سے بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ وہ پھر پنجرے میں بند کر دی گئی۔ ماں باپ نے بیماری کے لیے شادی کی دوا تجویز کی۔ مجھ سے نہیں کسی اور سے۔ دوا کارگر نہ ہوئی۔ چہکتی ہوئی چڑیا اپنے نئے پنجرے میں خاموش ہو گئی۔

خالد پر ایک لمحے کے لیے خاموشی کا دورہ پڑا۔ وہ دور بہت دور کچھ دیکھتا رہا۔ آگ سلگتی رہی۔ چنگاریاں پھلجھڑی کے

پھولوں کی طرح ناچتی ہوئی فضا میں تحلیل ہوتی رہیں۔ خالد کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں وہ کہنے لگا۔

"باربرا ہندوستانی اور یورپین محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے ہم دونوں عشق کی اس منزل پر جسمانی سہارا لیے بغیر پہنچے تھے۔ یہ لب آج بھی تشنہ ہیں اس وقت بھی تشنہ تھے۔ یہ اس آفتِ جاں کے ہونٹوں تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ——— محبت کی مہر ثبت کرنے کے لئے صرف ہونٹوں کا ملاپ کافی نہیں ہوتا۔"

خالد دیر تک ماضی میں گھومتا رہا۔ باربرا خاموشی سے جانے کیا سوچتی رہی۔ آتش دان کی بھڑکتی ہوئی آگ کا بیشتر حصہ راکھ بن کر نیچے گر چکا تھا۔ اور کمرے میں ٹھنڈک آہستہ آہستہ داخل ہو چکی تھی۔

خالد فرش پر سے اٹھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر آہستہ سے باربرا کو گود میں اٹھا لیا۔ دو جسموں کی گرمی موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ بڑی دیر تک باربرا کو گود میں اٹھائے رہا پھر اس کے حسن میں کھویا رہا۔ پھر کہنے لگا "باربرا تم پھول کی طرح نازک ہو۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں تم میرے ہاتھوں میں ٹوٹ نہ جاؤ۔"

"ڈارلنگ۔ تم مجھے چھوڑ نہ دینا۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں، تمہارے بنا میرا دم نکل جائے گا۔"

"ہم دونوں ساتھ مریں گے۔" اور یہ کہتے ہوئے خالد۔

باربرا کو پلنگ پر لٹا دیا۔
صبح بہت جلدی آگئی۔ یا پھر باربرا کی رات ہی نہیں ہوئی تھی۔ خالد نے جب آنکھ کھولی تو باربرا چائے بنا کر اس کے سرہانے کی چھوٹی میز پر سجا چکی تھی۔ لیکن وہ پھر سو گیا۔ باربرا خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نظریں کھڑکی سے گزر کر لمبی سڑک پر بھٹکتی رہیں۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں پر سرخ پھول بے رنگ تھے۔ یخ بستہ ہوائیں گرے ہوئے زرد پتوں کو اڑاتی پھر رہی تھیں۔ باربرا زرد پتوں کا رقص دیکھتی رہی۔ بے جان پتے۔ درخت سے الگ ہو کر کتنے دن اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں ــــ باربرا سوچنے لگی خالد کا سابقہ عشق ان زرد پتوں سے کتنی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ بھی مرچکا ہے۔ دم توڑ چکا ہے۔ ایک خراش باقی ہے جسے مندمل ہونے میں وقت لگے گا۔ لیکن دل کے ایک کونے سے خدشے بھی سر اٹھا رہے تھے۔

"اگر خالد کا یہ عشق ابھی تک باقی ہے تو پھر باربرا اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔ وہ اس کمرے میں تنہا خالد کے ساتھ کیوں بند ہے۔ اس نے اپنا سارا لباس اتار کر پیدائشی لباس کیوں پہن رکھا ہے؟"

خالد نے کروٹ لی تو باربرا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ مسکرائی "گڈ مارننگ"

خالد: "مجھے یہ سلام اچھے نہیں لگتے کیوں کہ یہ "گڈ مارننگ" سے شروع ہو کر گڈ نائٹ تک پہنچ جاتے ہیں" دونوں ہنس پڑے

باربرا نے خالد کے لیے چائے کی ایک پیالی بنائی۔ پھر کہنے لگی۔
"صبح صبح جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ ایک بات پوچھوں۔
خالد" یہ سچ بولنے کی نصیحت اسی لیے کی گئی ہے "
باربرا "خالد وہ لڑکی یقیناً بہت خوبصورت ہوگی۔ ہندوستانی لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں "
خالد نے باربرا کو ایک جھٹکے سے اپنے قریب کھینچ لیا۔
"ہاں وہ بھی خوبصورت تھی۔ لیکن تم ۔ تم سچ مچ نقش آخر ہو۔ دیکھیں صبح تڑکے تمھارے ہونٹوں کا مزہ کیسا ہوتا ہے "
باربرا نے اپنے کو خالد کی گرفت سے نکال لیا۔
خالد" باربرا کھڑکی کے سامنے یہ جو درخت لگا ہے۔ اس کو میں نے بارہا پھولوں سے لدا ہوا دیکھا ہے۔ لیکن پت جھڑ میں جب یہ ننگا ہو جاتا ہے۔ تو جانے کیوں یہ مجھے کہیں زیادہ حسین اور دلکش لگتا ہے "
باربرا " ہاں بعض جسم ننگے اچھے لگتے ہیں "
"اچھے نہیں بہت اچھے لگتے ہیں " خالد نے باربرا کو گھسیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ پھسل کر نکل گئی " تمھارا اپنے جسم کے بارے میں کیا خیال ہے "
باربرا " ابھی تو ٹھیک ہے "
خالد " ابھی تو ۔ سے کیا مطلب "
باربرا " مطلب یہ ہے کہ پھول تھوڑے دنوں کے لیے کھلتے ہیں۔ جب یہ پیٹ اپنے پھول جائے گا تو میں لڑکی سے عورت بن

جاؤں گی۔

خالد "بچے پال سکتی ہو۔"

باربرا "مجھے دوسروں کے بچے اچھے لگتے ہیں اپنے تو لوٹ لیں گے۔"

خالد "کتنے بچے پال سکتی ہو؟"

باربرا "تمھارے ہوں تو دس۔"

خالد "تب تو تم کو دس سال ترستا ہو گا۔ میں تو ایک بچے پر پاگل ہو جاؤں گا۔ تمھیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوں گا۔"

باربرا مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور خالد کی گود میں بیٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "خالد میں تم کو بھاگنے نہیں دوں گی۔ اس طرح سے جکڑ لوں گی۔"

باربرا کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ لیکن خالد کے صحت مند بازو جب کسنا شروع ہوئے تو باربرا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ ہونٹ سے ہونٹ ملا کر خالد نے باربرا کو آہستہ سے ایک طرف گرا دیا۔ پھر خود اٹھ کر اپنے دونوں بازوؤں کے سہارے اس طرح بیٹھ گیا کہ باربرا ان کے درمیان لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے دعوت دی اور خالد نے چھے انچ کے فاصلے سے باربرا کی آنکھوں میں ڈوبنا چاہا لیکن باربرا کے موٹے مقناطیسی ہونٹوں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کافی دیر کے بعد وہ ایک طویل گرم اور مسلسل پیار سے چند لمحوں کے لیے ابھرا جیسے مچھلی سانس لینے کے لیے باہر آئی ہو۔

"باربرا مجھے موٹے ہونٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔ کم سے کم یہ

گرفت میں تو آتے ہیں"۔

پھر ایک طوفان اٹھا۔ کڑکڑاتی سردیوں کا موسم آن کی آن میں بدل گیا۔ وہ جو ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہ ڈوب سکے تھے پسینے میں ڈوب گئے۔

جیسے پہاڑوں سے گرنے والا دریا میدانی علاقے پہنچ گیا ہو۔ خالد نے سکون محسوس کیا۔ ذہن کو کچھ چھوٹ ملی تو اس نے فلسفہ وجودیت کی کتاب اٹھا لی۔ باربرا اٹھ کر کافی بنانے میں مشغول ہو چکی تھی۔ پنیر کی پلیٹ اس نے خالد کے سرہانے رکھ دی۔ وہ اس کے ورق کاٹ کاٹ کر کھاتا رہا۔ پڑھتا رہا۔ باربرا نے پیانو پر کوئی دھن چھیڑی۔ جسے سن کر خالد کے خیالات بکھر بہکے۔ اس کی محبت سے سرشار نظریں باربرا کے جسم کی ہر جنبش کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ سوچتا رہا پھر نفسیات کے ڈاکٹروں کی طرح کہنے لگا۔

"باربرا میں تم سے ایک سوال پوچھنے جا رہا ہوں۔ جس کا جواب دینے کے لیے میں تم کو صرف تین سکینڈ دوں گا۔ اور اگر تین سکینڈ سے زیادہ تم نے سوچا تو پھر جواب دینے کی ضرورت نہیں بولو منظور ہے۔"

باربرا ہنستے ہوئے کہنے لگی "منظور ہے"۔

"ازدواجی زندگی سے متعلق کوئی قصہ، کوئی لطیفہ، کوئی واقعہ سناؤ"۔ باربرا نے مشکل سے دو سکینڈ سوچا ہوگا۔ پھر کہنے لگی۔

"ہاں ایک واقعہ ہے جو شاید میں کبھی نہ بھول سکوں"۔

خالد "کیا ہے فوراً سناؤ"
باربرا "شیلا سے تم ملے ہو۔ اس کی ماں یہ قصہ ہم لوگوں کو سنایا کرتی تھی۔ وہ جب کالج میں پڑھتی تھی تو اپنی ایک سہیلی کے ساتھ مل کر اس نے ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا تھا۔ دونوں کے بوائے فرینڈ آیا کرتے تھے اور زندگی مسرتوں اور خوشیوں سے بھرپور تھی۔ ایک دن اس کی سالگرہ تھی اور اس کے بوائے فرینڈ نے بڑے سے ہوٹل میں بڑی سی پارٹی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بے چاری سارا دن بھی بنتی رہی۔ بازار جا کر ایک بہت قیمتی جوڑا خرید کر لائی۔ نئے طرح کے بال بنوائے اور ہر ہر بات پر اپنی سہیلی کا مشورہ لیتی رہی۔ شام کو جب بوائے فرینڈ نے نیچے سے ہارن بجایا تو شیلا کی ماں بھی بنی بھاگتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔ بوائے فرینڈ نے اسے بڑے غور سے دیکھا پھر پوچھنے لگا آخر آج تمھیں کیا ہو گیا ہے"
"آج میری سالگرہ ہے۔ اور تمھارے ساتھ جانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے"
بوائے فرینڈ "لیکن یہ سب کچھ بکواس ہے۔ یہ فراک مجھے پسند نہیں ہے۔ اور تمھارے بالوں کا یہ اسٹائل ایسا لگتا ہے جیسے تم پاگل ہو گئی ہو۔ تم فوراً واپس جاؤ اور اپنا حلیہ بدل کر پانچ منٹ میں نیچے آجاؤ"
وہ بے چاری پہلے تو سمجھ نہ سکی۔ خاموشی سے اپنے بوائے فرینڈ کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے کہہ رہی ہو "سچ سچ بتاؤ"
"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم جاؤ اور اپنا حلیہ بدل کر آؤ"

شیلا کی ماں بھاگتی ہوئی اوپر گئی۔ اور روزمرہ کے کپڑوں میں سے ایک فراک نکال کر بدلی۔ پانچ گھنٹوں میں بالوں کو جو ترتیب دی گئی تھی۔ وہ کنگھے کے چند مضبوط جھٹکوں نے دو منٹ میں برابر کر دی۔

اس کی سہیلی اُسے بار بار سمجھاتی رہی کہ تمہیں الٹا اپنے بوائے فرینڈ کو ڈانٹ دینا چاہیے۔ ایسی بے عزتی میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہاری اپنی بھی تو کوئی پسند ہونی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن شیلا کی ماں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر مسکراتی رہی اور پھر بھاگتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔

اس واقعے کو بہت دن بیت گئے کئی سال بیت گئے۔ زندگی کے ایک موڑ پر دونوں سہیلیاں پھر ملیں۔ اور جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا تو معلوم ہوا کہ شیلا کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار ہے اور اس کی سہیلی کو ایک بار طلاق ہو چکی ہے اور دوسری طلاق کا کیس عدالت میں ہے۔

خالد "یہ واقعہ تو مجھے سنانا چاہیے۔"

باربرا "اگر تم نے سنایا ہوتا تب بھی مجھے زندگی بھر یاد رہتا۔

خالد بڑی دیر تک جانے کیا سوچتا رہا۔ اسے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ اور باربرا امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ پھر وہ باربرا سے کہنے لگا۔

خالد " ذرا یہاں آؤ۔ میرے پاس۔"

باربرا کچھ سمجھ نہ سکی وہ خاموشی سے خالد کے پاس آ گئی۔

خالد نے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر چہرے کو ذرا سا اوپر اٹھایا پھر کہنے لگا۔

"کہیں تم وہی تو نہیں ہو"

باربرا "کون؟"

خالد "جس کو میں ایک مدت سے تلاش کر رہا تھا"

باربرا ہنس پڑی پھر کہنے لگی۔

"ایک بات بتاؤ گے، لیکن صحیح صحیح بتانا ہوگی"

"میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا" خالد نے دعوا کیا۔

باربرا خاموشی سے خالد کی طرف دیکھتی رہی۔ خالد کی الجھن بڑھ رہی تھی آخر کہنے لگا "پوچھتی کیوں نہیں ہو"

"ڈر لگتا ہے کہیں سچ سے میرا دم نہ نکل جائے۔ پوچھنا یہ تھا کہ ہم دونوں نے ابھی جو ہیجانی لمحہ گزرا ہے اس میں تمہارے ساتھ کون تھا۔ میں یا تمہارا پہلا عشق"

خالد نے قہقہہ لگایا۔ کتاب ہاتھ سے رکھ کر اس نے باربرا کو اپنی گود میں کھینچ لیا "باربرا تمہاری موجودگی میں تو خدا بھی یاد نہیں آتا"

"ڈارلنگ بس ان ہی دونوں کو غیر حاضر رہنا چاہیے"

باربرا کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ لیکن اسی لمحے غم کے بادل اتر آئے۔ وہ خالد کی گود سے نکل کر گم سم بیٹھ گئی۔ خالد نے اس کی پریشانی کو محسوس کیا۔ پھر اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگا۔

"ایسے موقعوں پر اداس نہیں ہونا چاہیے، شگون اچھا نہیں ہوتا۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

"خالد میں سوچ رہی تھی کہ اگر کچھ ہو گیا تو؟" وہ بدستور خلا کو دیکھ رہی تھی۔ خالد ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اور پھر تعجب سے پوچھنے لگا "باربرا کیا اس کے امکانات ہیں!"

"امکانات کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن فرض کرو کہ اگر کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

خالد بہت سنجیدہ تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ "ہو گا یہ کہ کسی ڈاکٹر کی مدد لینا پڑے گی۔ ہم لوگوں کے حالات بالکل ایسے نہیں ہیں کہ بچے پال سکیں۔"

"بچے پالنے کے لیے کیسے حالات کی ضرورت ہوتی ہے؟" باربرا نے سوال کیا۔

خالد کسی قدر اونچی آواز میں کہنے لگا "کیسے حالات کی ضرورت ہوتی ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم ہے۔ میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے حالات جو ہیں ان میں بچوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

خالد کا جواب باربرا کو مطمئن نہ کر سکا۔ لیکن ایک فیصلہ کن انداز میں وہ اٹھی۔ وہ مسکرائی۔ اور پھر خالد کے گلے میں جھول کر اس کی ننگی گردن پر سینکڑوں پیار نچھاور کر دیے۔

یہ کیسی دنیا ہے یہ کیسا قحبہ خانہ ہے

باربرا شراب کے نشے میں سرزد ہو جانے والے گناہوں کی پیداوار تھی۔ ماں باپ خود ایک دوسرے کو نہ چاہ سکے تو اُسے محبّت کہاں سے ملتی۔ ٹیلی وژن سٹ کے سامنے پلی بڑھی لڑکی جب زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے ٹکراتی ہے تو اُسے فرار کے علاوہ کہیں سکون نہیں ملتا۔ ذرا سا خلوص، ذرا سی ہمدردی، ذرا سا پیار، اس کی آنکھوں میں نمی لے آتا ہے اور ذرا سی محبّت اسے کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ خالد کے پاس خلوص بھی تھا محبت بھی تھی اور جنم جنم کی پیاس بھی۔ دونوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک دوسرے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

باربرا سے مل کر خالد کی زندگی کا ایک بہت بڑا خلا پُر ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں توازن سا محسوس کیا۔ اس کی بے ترتیب زندگی میں جانے کہاں سے دبے پاؤں سلیقہ داخل ہو گیا تھا۔

خالد کو جینے کا ایک سہارا ملا تو وہ اپنے احباب کے حلقے سے ایک دم کنارہ کش ہو گیا۔ اس کا منظر سے اس طرح غائب ہو جانا سب دوستوں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ برنی جب ادھر ادھر فون کرکے ہار گئی تو اس نے آنند سے خالد کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آنند کو زندگی کے اس مرحلے کا کافی تجربہ تھا اس کو دوستوں کی پریشانی ناتجربہ کاری کا سبب معلوم ہوئی۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے خالد کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ آنند کی آواز تین پوائنٹ بیر کی تقویت لیے ہوئے تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"خالد یہ فون میں اس لیے کر رہا ہوں کہ آج کل تمھیں میرے مشورے کی ضرورت ہوگی۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں تمھارا دم نہ نکل جائے پہلے عشق میں۔"

"لیکن ـــــ لیکن تم کو کیسے پتا چلا۔" خالد نے گھبرا کر پوچھا

"دیکھو خالد میں چار ہلکے پھلکے اور تین جان لیوا عشق کے معرکوں سے زندہ و سلامت نکل آیا ہوں۔ لندن میں اگر آدمی پہلے عشق سے بچ کر نکل آئے تو بعد میں اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی حادثے سے بال بال بچ کر نکل آیا ہو -- بہرکیف تم فوراً مجھ سے ملو۔"

خالد حیران تھا کہنے لگا "میرا خیال تھا کہ تم نے کبھی عشق نہیں کیا ہے آنند۔"

آنند دوسری طرف مسکرایا "تمھارا یہ بھی تو خیال ہے کہ

عشق میں آدمی بد حال ہو جاتا ہے۔ کھویا کھویا رہنے لگتا ہے۔ بال الجھ جاتے ہیں اور اس کی ساری شخصیت ایب نارمل ہو جاتی ہے، کیوں ہے نا یہی خیال؟"

"تم کسی حد تک ٹھیک ہو" خالد نے جواب دیا۔

"میں بڑی حد تک ٹھیک ہوں۔ ایک بات اور یاد رکھنا۔ لندن میں شادی کرنا سب سے زیادہ آسان کام ہے۔ اور شادی سے بچ نکلنا سب سے زیادہ مشکل ـــ باندھ لو گرہ میں"

خالد "باندھ لیا گرہ میں ـــ اچھا یہ بتاؤ فون کیوں کیا ہے"

"فون اس لیے کیا ہے کہ کل ہمارے یہاں برتھ پارٹی ہے جینی چاہتی ہے کہ تم بھی مع اپنی فیملی کے شریک ہو"

خالد نے مذاق کیا "ارے بھائی فیملی کس کے پاس ہے"

"فیملی سے مطلب ہے ایک عدد گرل فرینڈ اور دو عدد بوتل، اب سمجھے"

"آنند میں ایک اور بات پوچھنا چاہتا تھا، تم کو باربرا کے بارے میں کیسے پتا چلا" خالد نے سوال کیا۔

"باربرا کو میں جانتا ہوں۔ اور یہ سن کر تمھیں تعجب نہیں ہونا چاہیئے"

خالد حیران تھا۔ لیکن آنند باربرا کو نہیں جانتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ لندن کی ہر لڑکی کو باربرا ہی سمجھتا تھا۔ لندن میں پھیلی ہوئی تنہائی۔ دلوں میں اتری ہوئی اداسی اور چاروں طرف

اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ کسی قبول صورت اور مہذب ہندوستانی لڑکے کا لندن میں اتنے دن اکیلے رہنا ممکن نہیں ہے۔ آنند نے خالد کی لمبی غیر حاضری کا مطلب ٹھیک ہی سمجھا تھا۔ نئی دوستی میں کہنے سننے کے لیے بہت سی نئی باتیں ہوتی ہیں۔

●

دوسرے دن آنند کے گھر پر بین الاقوامی قسم کا مجمع تھا۔ سب ہی لوگ اپنی اپنی فیملی کے ساتھ آئے تھے خالد اور باربرا کے علاوہ جین کی دوست مونا اپنے فرانسیسی دوست آندرے کو لے کر آئی تھی۔ تین کمروں میں لوگ تقسیم تھے۔ اور پس منظر میں بہت ہی دھیموں سروں میں موسیقی تھی۔ خالد کو برنی کا انتظار تھا۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ خالد نے آنند سے پوچھا بھی لیکن آنند کہنے لگا۔ "فیملی نہیں ہوگی !"

خالد ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا وہ سوچنے لگا کہ آنند کا خیال صحیح ہو سکتا ہے۔

اتنے میں ایک خوبصورت، گداز بدن، ستواں ناک اور پتلے ہونٹ والی لڑکی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ جین کہنے لگی۔

"خالد یہ ہے میری دوست مونا۔ اور یہ ہے اس کا سایہ اندرے" مونا ہنستے ہنستے کہنے لگی" او لا لا۔ میرا سایہ اتنا لمبا چوڑا کیسے

ہو سکتا ہے۔"

اتنے میں بار برا بھی اسی طرف آ گئی۔ جین نے آندرے سے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا "اور یہ ہے بار برا خالد کی دوست"
آندرے نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بار برا کی طرف بڑھا دیا۔
"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" آندرے کی آنکھوں میں شرارت تھی
بار برا اور آندرے نے مل کر قہقہہ لگایا۔ اور بار برا خالد سے کہنے لگی۔
"آندرے کو میں جانتی ہوں۔"

"ہم دونوں بہت ساتھ رہے ہیں۔" آندرے نے ہنستے ہوئے معصومیت سے کہا۔

خالد سوچنے لگا کہ یہ ساتھ کس قسم کا تھا۔ بار برا نے آج تک آندرے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ لیکن جلد ہی خالد نے اپنے بہکتے ہوئے خیالات پر قابو پا لیا۔ آندرے اور بار برا ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش تھے۔ جیسے مدتوں کے بچھڑے مل گئے ہوں۔
آندرے شوخی سے بولا "خالد اس سے ہوشیار رہنا۔ بہت ہی خطرناک لڑکی ہے۔"

بار برا نے آندرے کو ایک دم ڈانٹا "پھر تم نے اپنا بڑا سا منہ کھول کر چھوٹی سی بات کی۔ خالد اس کی باتوں میں نہ آنا۔"

"خطرناک سے میرا یہ مطلب ہے کہ ایک دفعہ جو بات اس کے دماغ میں چلی گئی پھر وہ نکلتی نہیں ہے۔"

"لیکن اندرے یہ تو اچھی بات ہے" خالد بولا۔

"اچھی بات تو ضرور ہے۔ لیکن فرض کرو کہ اگر کوئی غلط بات دماغ میں چلی گئی" آندرے کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

آندرے باربرا کی طرف پھر مخاطب ہو گیا "کوئی تین سال کے بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ اور اب تم خطرناک حد تک خوبصورت ہو گئی ہو"

"اور اسی لیے میں ان کے ساتھ ہوں" باربرا ابھی بولنے بھی نہ پائی تھی کہ خالد بیچ میں کود پڑا۔

مہمانوں کی تقسیم خود بخود ہی ہو گئی۔ ریڈیوگرام والے کمرے میں موسیقی اور رقص کے رسیا جمع ہو گئے۔ دوسرا کمرہ چھوٹا تھا اور ڈھکی چھپی بجلی کی روشنی نے کمرے میں اجالے سے زیادہ تاریکی پھیلا رکھی تھی۔ جہاں کچھ جوڑے اجالے سے بھاگ کر اندھیرے میں پناہ لینے کے لیے آ گئے۔

خالد باربرا مونا اور آندرے تیسرے کمرے میں آنند اور جین کے ساتھ تھے۔ مونا باربرا سے کچھ اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہی تھی جیسے دونوں ایک دوسرے کو مدتوں سے جانتے ہوں۔ آنند نے ابھی چند سیکنڈ پہلے، ماچس کی کئی تیلیاں اپنے پائپ پر ضائع کی تھیں۔ اور اب دھوئیں کے گہرے بادل اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ خالد کے ہونٹوں کے درمیان ایک تازہ سگریٹ جھول

رہی تھی اور ہاتھ لائٹر پر تھا جسے دیکھ کر آنند کہنے لگا۔

"خالد تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پائپ جلانے کے لیے اپنا لائٹر مجھے پیش کیا تھا۔ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

"کیوں خیریت ہے؟" خالد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"لائٹر سے صرف سگریٹ جلائی جاتی ہے۔" آنند 'صرف' کے لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"میں نے سینکڑوں لوگوں کو گیس کے لائٹر سے پائپ جلاتے ہوئے دیکھا ہے۔" خالد نے اعتماد سے کہا۔

"تم نے ہزاروں لوگوں کو بیچ سڑک پر پیک تھوکتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوا کہ وہ لوگ ٹھیک کرتے ہیں۔ اسی طرح لائٹر سے پائپ جلانے والے عام طور پر لاعلم یا اناڑی ہوتے ہیں۔ جن کو پائپ پینے کے آداب نہیں معلوم ہوتے ہیں، ہوتا کیا ہے کہ جب آپ لائٹر سے پائپ جلاتے ہیں تو گیس یا پٹرول سے نکلا ہوا شعلہ تمباکو پر اپنا خفیف سا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اور صاحب ذوق اس چیز کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔"

آنند کی بات سن کر آندرے سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ کہنے لگا "تم لوگ روایات کے غلام ہو۔ ان ہی چھوٹی چھوٹی بورژوائی نزاکتوں نے زندگی کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ جلانے والا جس کا جی چاہے جلائے۔ اس پر پابندیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بالکل پابندی نہیں ہے آپ کا جیسے جی چاہے جلا۔

آپ کا جہاں جی چاہے تھوکیے۔ مکمل آزادی ہے" خالد کے انداز میں طنز کی آمیزش تھی۔ پھر وہ آنند سے پوچھنے لگا۔

"اور سگار کے اناڑیوں کو کیسے پہچانا جاتا ہے؟"

"وہ تو بہت آسان کام ہے۔ نمبر ایک وہ سگار کو لائٹر سے جلاتا ہے۔ اور نمبر دو اس کے سگار کے پچھلے حصے میں ٹریڈ مارک کا کاغذی چھلا آخیر وقت تک لگا رہتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی سوٹ کے استر پر لگا ہوا درزی کا ٹریڈ مارک باہر جیب کے اوپر سلوا لے۔"

آنند کی نظر لڑکیوں پر پڑی جو ابھی تک اپنی باتوں میں منہمک تھیں۔ اس نے پارٹی کی مردانی اور زنانی تقسیم کو ختم کرنے کی کوشش کی "مونا ہمارے یہاں اگر کوئی سرگوشی کرے تو اُسے غیر مہذب آدمی سمجھا جاتا ہے۔"

"اور ہمارے اگر دو آدمی کسی غیر مانوس زبان میں باتیں شروع کر دیں تو انہیں غیر مہذب آدمی سمجھا جاتا ہے" مونا کا برجستہ طنز بڑے نشانے پر بیٹھا۔ خالد کو اپنی غلطی کا احساس فوراً ہوا۔ اس بدتمیزی کا مظاہرہ اس نے یہاں کی بہت سی محفلوں میں دیکھا تھا۔ لیکن آنند اِن باتوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ اپنی کمزوریوں سے چشم پوشی اس کی پرانی عادت ہے۔ خالد نے سب کی مشترکہ زبان میں ایک سوال اٹھایا۔

"آمدرسے کرسٹین کیلر برطانیہ کی اخلاقی گراوٹ کی سمبل ہے۔ اگر کرسٹین کیلر اور وارڈ کا واقعہ فرانس میں پیش آتا تو کیا وہاں

بھی اتنا ہی بڑا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا "

آمدرسے " تم نے دو سوال کیے ہیں۔ پہلا سوال یعنی کرسٹین کیلر کو سمبل بنانے پر مجھے ایک قصّہ یاد آگیا۔ ٹرافالگر اسکویر پر نلسن کا اسٹیچو دیکھا ہے۔

خالد : دیکھا ہے "

آمدرسے " ایک جرمن ٹورسٹ نے جب اس اسٹیچو کو دیکھا تو اپنے انگریز دوست سے پوچھنے لگا۔ یہ کون ہے؟ "

انگریز دوست بڑے فخر سے کہنے لگا " ارے تم ان کو نہیں جانتے۔ آج برٹن میں جو کچھ تم دیکھتے ہو اس کی بنیاد اس کا ستون اس کا موجد یہی شخص تھا۔ جرمن ٹورسٹ بڑی معصومیت سے کہنے لگا " نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنا بڑا الزام تم ایک شخص کے سر نہیں تھوپ سکتے ہو "

سب نے مل کر ایک قہقہہ لگایا۔ پھر آمدرسے کہنے لگا " اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ فرانس میں شوہروں کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے تعلق ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے حکومت کی بنیادیں ہل جائیں۔ ہمارے یہاں تو ازدواجی زندگی بھی اس واقعہ سے متاثر نہیں ہوتی "

مونا کسی قدر تلخی سے بولی " آمدرسے ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی ہے تمہارا ذہن ابھی سے بے ایمانی کی طرف مائل ہے۔ جب ایسی ذہنیت ہو ایک اچھی خوشگوار اور خوش حال فیملی کا تصور ہی کرنا غلط ہوگا "

"ہوتا جو بات کھلم کھلا، سب کے سامنے ایمانداری سے کہہ دی جائے وہ بے ایمانی کبھی نہیں ہو سکتی" آندرے نے سمجھانے کی کوشش کی۔

بار برا سے خاموش نہ رہا گیا۔ اس نے بھی بڑھ کر گفتگو کا ایک سرا پکڑ لیا۔ "کرسٹین کیلر کے واقعے کا سارا الزام اخباروں کے سر جاتا ہے۔ کسی کی بھی نجی زندگی میں جھانک کر دیکھا جائے تو گھناؤنے رخ ضرور مل جائیں گے۔ اور کسی کی بھی آوارہ گردی کو اگر اتنی پبلسٹی دیدی جائے تو وہ آپ ہی آپ قومی اسکینڈل بن جائے گی"

آنند نے خاموشی توڑی "مجھے کیلر اور ڈاکٹر وارڈ سے ہمدردی ہے۔ یہ اسکینڈل دراصل انگلینڈ کے اعلیٰ طبقے کی اخلاقیات کا جنازہ ہے۔ یہ سماج کی خرابی ہے جہاں کیلر جیسی لڑکیوں کو پندرہ سال کی عمر میں جنسی تجربے ہو جاتے ہیں اور پھر ۲۱ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اختلاط کی اکسپرٹ بن جاتی ہیں"

خالد کی مشرقیت جاگی اور وہ آندرے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"یہی وہ مقام ہے جہاں ہم مشرقی لوگ اپنی روایات کی قدر کرنے لگتے ہیں۔ یورپین سماج کی یہ خرابی ہے کہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو کم سنی میں جنسی تجربہ ہو جاتا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہاں کی ۸۰ فی صدی عورتوں کی شادی اس وقت ہوتی ہے جب وہ حاملہ ہو چکی ہوتی ہیں"

مارگریٹ سے چپ نہ رہا گیا "لیکن خالد اس میں قصور کس کا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر ایسی خطرناک صورت حال میں ۸۰ فی صدی لوگ شادی کر لیتے ہیں تو یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ورنہ یہ مظلوم لڑکیاں زہر کھا کر مر جائیں"

خالد پہلے تو خاموشی سے باربرا کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر کہنے لگا "میں تو ایسی صورت میں شاید کبھی شادی نہ کروں۔ یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔ مجھے اگر ایسی لڑکی سے شادی کرنا ہی پڑے تو میں پہلے اس کا ابورشن کراؤں گا اور پھر دھوم دھام سے شادی کروں گا"

آنند بیچ میں آ گیا "لیکن ابورشن کے لیے ہر لڑکی تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کے نقصانات بڑے دور رس ہوتے ہیں"

خالد "تو پھر یہ سارے خدشے رات گزارنے سے پہلے سوچنے چاہییں۔"

آنند "کس کو سوچنے چاہییں۔ تم کو یا لڑکی کو۔ ہم مشرقی لوگوں کی بس یہی ایک کمزوری ہے۔ جو خود ان کو کبھی نظر نہیں آتی۔ لطف اٹھائیں گے ساری رات اور اگر کوئی بات ہو گئی تو سارا الزام لڑکی پر رکھ کر الگ کھڑے ہوں گے۔ ارے بے وقوف آدمی اگر تم کو اپنی روایات اتنی ہی پیاری ہیں تو پھر پانچ ہزار میل کا سفر کر کے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمھاری روایات اگر اچھی ہیں تو ان پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ اور خالد صاحب آپ یقین جانیے یہی روایات ہیں جو آپ کے سارے ملک میں جنسی بھوک کو متعدی

بیماری کی طرح پھیلائے ہوئے ہیں۔"

خالد "جنسی بھوک کے لیے ملک اور قوم کی قید نہیں لگانا چاہیئے۔ یہ شے ہر جگہ ملتی ہے۔"

آنند "لیکن تمہارے یہاں جنسی بھوک، طاعون بن چکی ہے دیمک ہے دیمک جو نوجوانوں کی نشو و نما کو چاٹے لے رہی ہے۔ آج صبح ہی کی بات ہے۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے میرے پاس ایک ٹیلی فون آیا۔ آواز نئی تھی اس لیے میں پہچان نہ سکا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک پولیس کانسٹیبل نجی حیثیت سے بول رہا ہے۔ اس نے ٹیلی فون ڈائرکٹری اٹھا کر ہندوستانیوں کے نام تلاش کرنا شروع کیے تو میرا نام سامنے آگیا۔ معاملہ یہ تھا کہ ایک صاحبزادے اکزی بیشن ہال کے کیو میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے آگے ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اور یہ صاحبزادے بار بار کسی نہ کسی بہانے اس سے ٹکرا جاتے تھے۔ ایک دفعہ دو دفعہ تین دفعہ تو اس لڑکی نے گھور کر خفگی سے دیکھا بھی۔ لیکن ان کے اعصاب پر تو عورت سوار تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے انتہائی نامعقول حرکت کی۔ یعنی آہستہ آہستہ اس کے قریب کھسکتے گئے۔ اور پھر ایک دم اس کی پشت سے چپک کر اسے اپنی باہوں کی گرفت میں لے لیا۔ وہ بے چاری لڑکی بڑی زور سے چیخی، لیکن لڑکے کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کے منہ سے آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ لوگوں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اور جب اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ ہانپ رہا تھا۔ پولیس والے نے جب لڑکے کو پکڑا تو اس کے سارے کپڑے خراب ہو چکے تھے۔

خالد: "یہ تو پاگل پن ہے۔"

آنند: "بالکل ٹھیک ہے ایک سماج کیلر کو پیدا کرتا ہے، اور دوسرا سماج سیکس کے بھوکے پاگلوں کو جنم دیتا ہے۔

خالد: "لیکن پولیس والے نے تم کو فون کس لیے کیا تھا؟"

آنند: "مجھے اس لیے فون کیا تھا کہ صاحبزادے لندن میں کسی کو جانتے نہیں تھے۔ وہ اپنے بیان میں جھوٹ پر جھوٹ بولے چلے جا رہے تھے۔ پولیس والوں نے لاکھ سمجھایا کہ اگر تم سچ بولو گے تو ہو سکتا ہے کہ تم کو سزا نہ ملے۔

پولیس والے بے وقوف نہیں ہوتے انہوں نے اپنا ریکارڈ چیک کیا تو پتا چلا کہ ایک دفعہ اور، وہ کسی سیاح لڑکی کو پریشان کرنے کے جرم میں پکڑے جا چکے ہیں۔ اور بے وقوفی یہ کر رہے تھے کہ پولیس کے اس ریکارڈ کو وہ جھوٹا بتا رہے تھے۔

خالد میں اس لڑکے کی صورت کبھی نہیں بھول سکتا۔ عمر زیادہ نہیں تھی۔ لیکن چہرے پر ایک عجیب و غریب قسم کی وحشت آنکھوں میں ایک عجیب و غریب قسم کی بھوک اور ویرانی۔ گالوں کی ہڈیاں ضرورت سے زیادہ ابھری ہوئی۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ ایسے چہرے آپ کا تعاقب کرتے ہیں۔ میں نے اسے ہندوستانی زبان میں سمجھانے کی کوشش کی اور جب جھوٹ بولنے کے نتائج سے آگاہ کیا تو بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔"

آندرے کو سنجیدہ باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی ــــ وہ خاموشی سے دوسرے کمرے چلا گیا۔ بار بار اُسے آٹھتا دیکھ کر

مسکرائی۔ وہ خود بھی اٹھنا چاہتی تھی لیکن خالد کی سنجیدگی دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔

جین نے وسکی کی خالی بوتل ہٹا کر ایک نئی بوتل کھولی۔ آنند جب سب کے گلاس بھر چکا تو کہنے لگا۔

"اسی لیے کہتا ہوں کہ مسائل کو ملکوں میں بانٹنا نہیں چاہیے گنے چنے لوگ خراب ہوتے ہیں ملک خراب نہیں ہوتے۔ عوام کی اکثریت ہر ملک میں اچھی ہوتی ہے۔ اور پھر جنسی مسئلہ ایسا ہے جس کی پیچیدگیاں نہ کبھی سلجھی ہیں اور شاید نہ کبھی سلجھیں گی۔"

موسیقی کی لہریں اب اونچی ہو گئی تھیں۔ دوسرے کمرے سے ملے جلے قہقہے اٹھ رہے تھے۔ ایک دو جوڑوں نے اٹھ کر ناچنا بھی شروع کر دیا تھا۔ باربرا کا ذہن اب آنند کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ موسیقی کی دلنواز دھن اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

پائپ اور سگریٹوں کے دھوئیں نے بجلی کے بلب کو دھندلا دیا تھا۔ باربرا کو طبیعت گری ہوئی سی معلوم ہوئی۔ گلاس میز پر رکھ کر "ابھی آتی ہوں" کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ خالد باربرا کو دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ والٹز کی دھن شروع ہو چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ باربرا کو یہ رقص بہت پسند ہے کیوں نہ وہ بھی دوسرے کمرے میں جا کر اپنے کو موسیقی کی لہروں اور باربرا کی بانہوں کے سپرد کر دے۔

ابھی خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ دروازے سے ہرنی داخل ہوا۔ آنند اور خالد اس کا استقبال کرنے کے لیے

بڑھے تھے کہ ایک نازک سی لڑکی ان کے سامنے آگئی۔

برنی کہنے لگا "لنڈا ان سے ملو، یہ میرے دوست آنند یہ خالد اور یہ جین ہے۔ اور یہ ہے لنڈا۔ مسنر برنی بھی تم لوگ کہہ سکتے ہو۔"

خالد سناٹے میں آگیا۔ آنند نے پائپ منہ میں لگا کر ماچس جلائی۔ جین نے لپک کر لنڈا سے ہاتھ ملایا جیسے کہہ رہی ہو "بڑا اچھا کیا جو فوراً شادی کر لی۔"

آنند نے برنی کا گلاس بھرتے ہوئے ہندوستانی زبان میں پوچھا "کہیے شہید اعظم صاحب! غلامی کی دستاویز پر کس دن دستخط کیے تھے۔ محبت کے دوسرے دن یا تیسرے دن۔"

برنی: "کون غازی ہوا اور کون شہید، یہ تو بعد میں پتا چلتا ہے؟"

مونا ایک دم بول اٹھی "آنند تم پھر ہندوستانی بولنے لگے۔ ویسے میں جانتی ہوں تم برنی سے کیا پوچھ رہے ہو؟"

"اگر تم بتا دو تو جو انعام مانگو گی ملے گا۔"

مونا کہنے لگی "تم ان سے پوچھ رہے ہو کہ تم نے شادی کب کی؟"

آنند بڑی زور سے ہنسا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو اوپر سے نظر آتی ہو۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" مونا نے سوال کیا۔

"مطلب یہ ہے کہ تم بہت ہی ذہین لڑکی ہو۔" آنند نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا۔

خالد برنی سے بہت دنوں کے بعد ملا تھا۔ وہ برنی کے اس حادثے کی تفصیلات جاننے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن برنی نے بہت اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"نپولین سے منسوب کیا جاتا ہے یہ واقعہ شاید"

"کونسا واقعہ" خالد جواب کا منتظر تھا۔

"یہی کہ" دیکھا۔ پسند آیا۔ فتح کر لیا" خالد اور برنی دونوں ہنس پڑے۔ لیکن خالد نے برنی کا ہاتھ دبایا اور آنکھ مار کے کہنے لگا" مجھے بھی تمہاری بھابی کی بڑی فکر تھی۔ خدا بھلا کرے برتر نے انتظام کرکے گھر میں بھجوا دی ۔۔۔ چلو دوسرے کمرے میں چلتے ہیں تم کو ان سے بھی ملوا دیں"

دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے۔ کمرے میں سگریٹوں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ ہلکی روشنی ہلکی موسیقی اور ہلکا نشہ عجیب و غریب ماحول پیش کر رہا تھا۔ تین جوڑے رقص میں گم تھے اور بار بار آنکھیں بند کیے آندرسے کی باہوں میں جھول رہی تھی۔ خالد پر ایک لمحے کے لیے سکتے کا عالم طاری ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے پر قابو پا کر برنی سے صرف اتنا کہا" اُفوہ، یہاں تو دھواں بھرا ہوا ہے۔ کچھ نظر بھی نہیں آتا" اور پھر وہ برنی کا ہاتھ پکڑ کر واپس اسی کمرے میں لے آیا۔ برنی موقعے کی نزاکت کو بھانپ تو ضرور گیا لیکن اس نے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔

برنی اور خالد جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے مونا نے دونوں کو پکڑ کر ایک کو دائیں طرف اور دوسرے کو بائیں طرف

بٹھا لیا۔ اور خالد کے کان میں کہنے لگی۔
"آنند پر الہام کی کیفیت طاری ہو چکی ہے"
آنند پورے زور شور سے باتیں کرنے میں معروف تھا۔
جب اس نے برنی کو دیکھا تو کہنے لگا "ہم لوگ یہاں سیکس کی باتیں کر رہے تھے"
"یہ تو بڑھاپے میں کی جاتی ہیں" آنند نے برنی کی بات سن کر قہقہہ ضرور لگایا لیکن وہ اپنے موضوع سے ہٹا نہیں "تمھیں یاد ہے ہمارے گروپ میں ایک لڑکا تھا 'کوالسکی'" آنند نے سوال کیا۔
برنی ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا "شرمیلا یک طرفہ عشق کرنے والا"

"ہاں ہاں بالکل وہی۔ اس کے عشق کی داستان بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ جانے کتنا وقت اور کتنا پیسہ خرچ کرنے کے بعد اس نے ایک لڑکی سے تعارف حاصل کیا۔ اور پھر جب اس کی قربت حاصل ہوئی تو چاروں خانے چت ہو گیا۔ لڑکی واقعی خوبصورت ذہنی طور پر پختہ اور خوش مذاق تھی۔ کوالسکی اور اُسے کلب میں بلاتا شرابیں پلاتا۔ ڈراموں میں لے کر جاتا اور جب تعلقات بہت بڑھ گئے تو کوالسکی نے ہمت کی۔
"تم بہت خوبصورت ہو"
لڑکی: تو یہ بات بہت سے لوگ کہہ چکے ہیں
کوالسکی: اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بات غلط ہے۔
لڑکی نے ہنستے ہوئے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

کوالسکی: "یہ حسن تنہا کب تک پھرتا رہے گا"
لڑکی: "یہ تو خدا ہی بتا سکتا ہے"
کوالسکی: "میں خدا تو نہیں ہوں لیکن اس بات کا جواب دے سکتا ہوں"
لڑکی: "تم نہیں بتا سکتے کوالسکی"

کوالسکی نے لڑکی کا ہاتھ دبایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی اور پھر بہت رومنٹک انداز میں کہنے لگا "ڈارلنگ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری اس درخواست کو قبول کروگی؟"

لڑکی تھوڑی دیر تک خاموشی سے کوالسکی کو دیکھتی رہی پھر پتھر کا مجسمہ بول اٹھا "کوالسکی مجھے مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

کوالسکی بات سمجھ نہ سکا کہنے لگا "ڈارلنگ تم غلط لوگوں سے ملی ہوگی۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ سب کی محبت ایک جیسی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے تم کو دور سے چاہا ہے قریب سے چاہا ہے خوابوں میں محبت کی ہے اور میرا خیال ہے کہ میں اپنے کو تمھارے قابل بنا سکتا ہوں"

"لیکن میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے"

"شادی کے بارے میں میں نے بھی کبھی نہیں سوچا۔ لیکن جب ایک اچھی لڑکی مل جائے تو عشق کیے بغیر رہا بھی تو نہیں جا سکتا"

لڑکی: "اچھی لڑکی مل جائے تو عشق کے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔
کوالسکی مجھے مردوں میں کسی قسم کی جنسی کشش نہیں محسوس ہوتی"

کوالسکی کو لڑکی کا لہجہ کچھ اچھا نہیں لگا لیکن جب اس نے سر

اٹھا کر دیکھا تو لڑکی کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب مسکراہٹ تھی ۔ یہ وہ مسکراہٹ تھی جو کسی کی دل آزاری سے حاصل ہوتی ہے ۔ وہ کسی قدر غصہ سے کہنے لگا ۔

"تم جھوٹ بولتی ہو اگر تم کو مردوں سے دلچسپی نہیں ہے تو پھر تم روزانہ کلب میں ہم لوگوں کے گروپ میں کیوں بیٹھتی ہو؟"

"تمھیں تکلیف ہوگی اگر میں سچ سچ بتا دوں"

کوانسکی : "تم جتنی اذیت پہنچا سکتی تھیں پہنچا چکی ہو"

لڑکی بہت اعتماد سے بولی "کوانسکی میں اس گروپ میں اس لیے شامل ہوتی ہوں کہ وہ گروپ خوبصورت کنوارے لڑکوں کا ہے ۔ جہاں لڑکیاں شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹتی ہیں ۔ میں نے اسی گروپ سے سینڈرا کو اڑایا تھا"

"تم کتنی خبیث ، کتنی مکروہ اور کتنی گھناؤنی ہو" کوانسکی بڑی زور سے چیخا ۔ اس کو اپنی نفرت کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ سخت لفظ نہ ملے ۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے قے ہو جائے گی ۔ یہ سارا ماحول کتنا گھناؤنا ہے ۔ تھوڑی دیر وہ ساکت بیٹھا رہا پھر اس نے ایک لمبی سانس لی اور ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ وہ اس عورت کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے ۔ لیکن پھر ذہن کے دروازے کھل گئے ۔ آنکھوں پر جیسے دوربین لگ گئی ۔ دور کی سب چیزوں کا ایک ایک خط نظر آنے لگا ۔ اس لڑکی کی پچھلے تین مہینے کی ہر بات ہر ادا نے اپنا رنگ اور اپنا مطلب بدل دیا کوانسکی کو بہت دیر میں معلوم ہوا کہ اس کی محبوب ایک سڑک کے

پیڑ کی طرح خوبصورت اور بے فیض ہے جو نہ پھل دے سکتا ہے اور نہ گھنا سایہ۔"

جین بہت دیر سے خاموش بیٹھی سیکس پر دیے جانے والے وعظ کو سُن رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"سیکس ایک نجی مسئلہ ہے۔ اس کا تانا بانا صرف دو انسانوں کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر وہ دو انسان بالغ ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔"

مونا سے ضبط نہ ہو سکا "لیکن جین اس کی کہیں کوئی نہ کوئی حد تو مقرر کرنا ہوگی۔ ورنہ بے راہ روی اتنی زیادہ پھیل جائے گی کہ پھر اس کا تدارک قابو سے باہر ہو جائے گا۔ اور پھر یہ مسئلہ نجی مسئلہ نہیں رہے گا۔ سماجی مسئلہ بن جائے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنسی آگ کو نہ ماں باپ روک سکتے ہیں اور نہ قانون۔ اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب۔ مذہب کی قدریں اگر تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی جائیں تو پھر تم کو گناہ سے ڈر لگے گا۔ اس وقت ڈر لگے گا جس وقت تنہائی میں تم گناہ کرنے جا رہی ہوگی۔ خدا کا خوف اگر دل میں ہوگا تو پھر بہکنے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔"

لنڈا ابھی تک خاموش بیٹھی ہوئی باتیں سن رہی تھی۔ اب اس نے بحث کا سرا پکڑا "آنند گناہ کیا چیز ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس چیز کو گناہ نہ سمجھتی ہوں جسے تم سمجھتے ہو۔ تمہارے دیس میں سڑکوں پر پیار کرنے والے پکڑ لیے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ تمہارے یہاں مرد سڑکوں پر ایک دوسرے

کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل سکتے ہیں لیکن ہمارے یہاں یہ حرکت انتہائی بری سمجھی جاتی ہے۔ تم اپنے یہاں خوشبوئیں لگا کر عطر مل کر گھومتے ہو اور اگر مرد عطر لگائے تو شریف آدمی اس کے پاس سے اٹھ کر چلے جائیں گے تو اگر ہر ملک کی اپنی اخلاقی قدریں ہو سکتی ہیں تو کیا ہر شخص کی اپنی قدریں نہیں ہو سکتیں ؟"

خالد نے موقع دیکھ کر ایک دم سوال کیا۔

"لنڈا تمہاری اخلاقی قدریں کونسی ہیں ؟"

"وہی جو تمہاری ہیں " لنڈا نے جواب دینے میں وقت نہیں لیا۔

"ہم تو ایک کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں "

"اور ہم تو ایک کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ چکے ہیں " لنڈا کے برجستہ جواب پر محفل میں ایک قہقہہ گونجا اور خالد نے برنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"برنی یہ انتخاب مبارک ہو۔ لیکن ہمارا انتخاب بھی تم سے کم نہیں ہے۔ دیکھو ہم بھی تم کو اپنی قسمت سے ملواتے ہیں "

خالد دوسرے کمرے کی طرف دیکھ کر چلایا "باربرا" دوسرے کمرے سے کوئی آواز نہیں آئی۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ ٹیلی فون خالد کے پاس رکھا ہوا تھا اس کو ٹیلی فون کی بے وقت گھنٹی بہت بری لگی۔ اس نے پہلے ٹیلی فون اٹھایا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ لائین کٹ گئی۔ وہ پھر چلایا "باربرا" دوسرے کمرے کی خاموشی بدستور قائم رہی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر بٹن دبا دیا

ہیلو ہیلو کی آواز بٹن دباتے ہی بند ہو گئی۔ اس دفعہ اس نے احتیاطاً ریسیور میز پر رکھ دیا۔ وہ دوسرے کمرے کی طرف دیکھ کر پھر چلایا "یارب!" کوئی آواز نہیں آئی۔ خاموشی، خاموشی۔ خاموشی، خالد کو خطرے کے احساس نے ایک دم گھیر لیا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔ لیکن مونا کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

"خالد۔ کہاں جا رہے ہو، وہ دونوں ابھی باہر گئے ہیں"

"کون دونوں ابھی باہر گئے ہیں" خالد کے اوپر اور نیچے کے دانت ایک دوسرے کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انگلیوں نے مٹھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ مونا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مونا سہم گئی۔ اس کا جواب مختصر تھا۔ "یار برا اور آنند رسے"

"حرامزادہ" خالد دروازے کی طرف بھاگا۔ لیکن مونا نے لپک کر اس کا کوٹ پکڑ لیا "چھوڑ دو مجھے" مونا ایک جھٹکے میں میز پر جا کر گری دو تین گلاس فرش پر لڑھک گئے۔ اتنے میں برنی بھی دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ سب نے خالد کو پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھا دیا۔ خالد کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے بار بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن برنی کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں باہر گئے ہوں گے۔ ابھی آجائیں گے۔ بلکہ ہم سب لوگ ان کا انتظار کریں" مونا کا ذہن صاف تھا وہ کہنے لگی۔ "میں آنند سے کو جانتی

ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی واپسی کا انتظار بے سود ہوگا" پھر وہ خالد سے کہنے لگی "خالد آج یار برا نہیں آئے گی"

خالد پوری طاقت سے چیخا "تم جھوٹ بولتی ہو"

"میں نے صرف اپنی رائے دی ہے" مونا کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ اور اسی ٹھہراؤ کو دیکھ کر خالد بھڑک اٹھا۔ اس نے لپک کر مونا کا گریبان پکڑ کر اُسے کھڑا کر دیا "تم۔ تم اس کی دلال ہو یا گرل فرینڈ" برنی نے خالد کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس کو صوفے پر دھکا دیتے ہوئے برنی بڑی زور سے چیخا "کیا بدتمیزی ہے۔ آدمی ہو یا جانور"

خالد کو جیسے کسی نے ہپنوٹائیز کر دیا ہو۔ وہ بے جان ہو کر صوفے پر گر گیا "او میرے خدا یہ کیسی دنیا ہے یہ کیسا قحبہ خانہ ہے"

آنند اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا یہ سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ لیکن جب خالد اس کے پاس آکر صوفے پر گرا۔ تو آنند نے ایک لمبا کش لے کر منہ سے پائپ نکالا۔ دھوئیں کا ایک ہلکا سا بادل خالد اور آنند کے بیچ میں حائل ہو گیا۔ پھر آنند کہنے لگا۔

"خالد لندن ایک بڑا سا ریس کورس ہے۔ اور تم زندگی میں چوں کہ پہلی دفعہ ریس کورس میں آئے ہو تو حیران ہو کر پوچھ رہے ہو "یہاں گھوڑے اتنا تیز کیوں بھاگتے ہیں! اور یہ ایک بے وقوفی کا سوال ہے"

باربرا بدحواس ہو کر جب آنند کے گھر سے نکلی تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور سارے جسم میں ——— ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ آندرے اگر اس کو سہارا نہ دیے ہوتا تو شاید وہ کب کی زمین پر ڈھیر ہو چکی ہوتی۔ آنتوں کو کھرچ ڈالنے والی متلی پورے زور شور سے ہوتی۔ لیکن اوپر پہنچتے پہنچتے غائب ہو جاتی۔ ایک کرب کے عالم میں اس کا منہ کھل جاتا۔ منہ سے تو کچھ نہ نکلتا۔ ہاں آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ اور اسی تشنج کے عالم میں اس کے کان خالد کی آواز سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا " یہ بلیک میل ہے۔ سراسر بلیک میل ہے "

اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ لیکن جب یہ پیچھا کرتی ہوئی آواز پھر بھی نہ رکی تو پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔

" نہیں۔ نہیں۔ یہ بلیک میل نہیں ہے۔ خالد یہ سچ ہے یہ سچ ہے خالد۔

آندرے ابھی تک باربرا کی ایک بات بھی نہ سمجھ سکا تھا وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ کہیں باربرا پر کوئی دورہ تو نہیں پڑا ہے۔ یا پھر وہ شدید بیمار ہے۔ اور پھر جب باربرا کو تھوڑا سکون ہوا تو آندرے پوچھنے لگا۔ " باربرا کیا بات ہے مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو بیا "

" میں خود بھی یہی جاننا چاہتی ہوں آندرے ـــ تم مجھے فوراً کسی اسپتال لے چلو۔ میری طبیعت بہت خراب ہے آندرے "

رات کے سناٹے میں جب ٹیکسی اسپتال کے سامنے رکی تو باربرا اپنے وہم اور فرضی خدشوں کے نیچے دب کر ادھ مری ہو چکی تھی لیکن جب تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر مسکرایا تو باربرا نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر؟"

"کچھ نہیں۔ اب آپ کو احتیاط کرنا ہوگی۔ آپ حاملہ ہیں۔"

تقدیر کا یہ اعلان سن کر باربرا نے ایک عجیب وغریب تغیر محسوس کیا۔ اس کا تشنج اس کی گھبراہٹ، اس کی نروس نس سب ختم ہو چکی تھی۔ وہ ایک اطمینان ایک سکون محسوس کر رہی تھی۔ پھر آندرے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرائی "آندرے اب تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔"

ڈاکٹر بھی آندرے کو دیکھ کر مسکرایا "یہ پہلا لڑکا ہے۔"

آندرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ ڈاکٹر کو کیا جواب دے۔ باربرا اس کی طرف سے بول اٹھی "ہاں ڈاکٹر"

ڈاکٹر نے لپک کر آندرے سے ہاتھ ملایا اور مبارکباد دے کر نسخہ لکھنے لگا۔

باربرا کا ذہن پارہ کی طرح بھٹک رہا تھا۔ کبھی وہ جست لگا کر مستقبل میں پہنچ جاتا اور کبھی ماضی اسے اپنی طرف کھینچ لیتا۔ ماضی کے جانے کتنے بہت سے دن تھے جو ایک نیا لباس پہن کر اس کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ خالد کہہ رہا تھا "ہوگا یہ کہ کسی ڈاکٹر کی مدد لینا ہوگی۔" اب خالد اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ہم لوگوں کے حالات بالکل ایسے نہیں ہیں کہ ہم بچے پال سکیں۔"
بار بار اس کو سمجھا رہی تھی اور وہ چلّا رہا تھا "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے حالات جو ہیں ان میں بچوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

پھر اُسے آنند کی پارٹی یاد آ گئی۔ خالد چیخ رہا تھا۔
"میں ایسی صورت میں شاید کبھی شادی نہ کروں۔ کبھی شادی نہ کروں کبھی شادی نہ کروں۔"

"بس بس خالد بس کرو خدا کے لیے بس کرو۔"
اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیے "او خدا یہ صدائے بازگشت بند کرتا ہو گی، پھر وہ گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگی۔"
"خالد تم جانتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ خالد تم جانتے ہو کہ یہ بچہ تمھارا ہے۔ خالد تم جانتے ہو کہ میرا، تمھارا اور اس معصوم بچے کا مستقبل ایک دھاگے میں پرو دیا ہوا ہے۔ اس دھاگے کو مت توڑو، خالد نہیں تو یہ سارے موتی بکھر جائیں گے۔ اور پھر کون جانے کون سا موتی گندی نالی میں بہہ جائے۔"

●

دلِ خانہ خراب کی باتیں

خالد آنند کی بوتل پارٹی میں ہنس مکھ اور بے غم نوجوان کی طرح ایک خوبصورت لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر فاتحانہ انداز میں داخل ہوا تھا۔ جیسے اس نے زندگی کے سارے محاذ فتح کر لیے ہوں ۔ لیکن جب واپس لوٹا — تو خالد ایک پریشان آدمی تھا۔

وہی کمرہ تھا۔ وہی کرسی تھی وہی ماحول تھا، وہ بستر پر لیٹ گیا۔ پہلے تو کمرے کی چھت پر آنند کی پارٹی کی فلم دیکھتا رہا۔ پھر خیالات نے اکبارگی کھل جانے والے نل کی طرح گھر کی چہار دیواری میں ابل پڑے۔ ضبط نے ساتھ چھوڑ دیا تو تکیے پر منہ رکھ کر زاروقطار رونے لگا۔ "یار برا تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں نے تمھاری پوجا کی ہے یار برا"

اور جب وہ روتے روتے نڈھال ہو گیا تو اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ نیند کے پنکھ کھل گئے، اور پھر سب کچھ اس کے سائے میں آ گیا۔

گہری نیند سے جب آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ فضا دھندلی تھی اور سردی کی شدت نے گیس کے جلتے ہوئے ہیٹر کو اتنا سرد

کر دیا تھا کہ اس کو چھو کر دیکھا جا سکتا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ قالین کے پھول بوٹوں پر اس طرح نظریں دوڑاتا رہا جیسے بچے کاغذی بھول بھلیوں پر پنسل چلاتے ہیں۔ پھر اس نے کروٹ لی۔ نظریں چھت پر پہنچیں اور فلم پھر شروع ہو گئی۔

کل رات کتنی جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ کتنی ڈھیر ساری پاک صاف اور خوش آیند محبتوں کا خون ہوا تھا۔ کتنے بہت سے منصوبے بن کر بگڑ گئے تھے ———— مستقبل کی اس نے کتنی حسین تصویریں بنائیں تھیں سب کی سب کسی نے روند ڈالی تھیں۔

اس کے دماغ پر ہتھوڑے چل رہے تھے۔ اور ان کی ہر چوٹ یہی کہتی تھی " خالد تم دھوکا کھا گئے۔ خالد تم دھوکا کھا گئے۔ لیکن اب وہ بار بار اسے کبھی نہیں ملے گا۔ چاہے اس کو یہ گھر چھوڑ دینا پڑے۔

گھر ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جب تک دوسرا گھر نہ ملے وہ پو پھٹے گھر سے نکل جائے گا اور دیر رات کو گھر واپس آئے گا۔ اس گھر میں اب اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔

خالد کو فیکٹری میں اوور ٹائم کرنے سے ہمیشہ نفرت رہی۔ لیکن اب اُس نے فیکٹری میں روزانہ اوور ٹائم کرنا شروع کر دیا۔ ڈک نے کئی دفعہ اس سے ہنستے ہوئے پوچھا بھی " میٹ شادی کرنے کا ارادہ ہے " لیکن خالد بات کو ہنسی میں ٹال گیا —

فیکٹری سے نکل کر وہ سیدھا شراب خانے میں چلا جاتا کبھی اکیلا اور کبھی ڈک کو ساتھ لے کر۔ ڈک نے کئی دفعہ خالد کی پریشانی معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کو بتانے سے وہ ہمیشہ انکار کرتا رہا۔

"تو پھر اتنی شراب کیوں پینے لگے ہو" ڈک سوال کرتا۔

"یونہی جی بہلانے کے لیے" خالد ڈک کو بہلا دیتا۔

"تم نے اسے اپنی پریشانیوں کو حل کرنے کی دوا تو نہیں سمجھا ہے" اور خالد کو یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ باربرا سے ملا تھا تو اس نے بھی یہی کہا تھا۔ اس نے شاید کہا تھا "شراب اگر آپ کسی مسئلے کے حل کی تلاش کے سلسلے میں پیتے ہیں تو بہتر یہی ہوگا کہ چھوڑ دیجیے"

"ڈک تم مطمئن رہو۔ پریشانیاں میرا پیچھا نہیں کرتیں" خالد ڈک سے یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی جس سے میں محبت کرتا ہوں کسی دوسرے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

خالد اکثر سوچتا "باربرا میرے کتنا قریب تھی۔ وہ ذہنی طور پر بری تھی جسمانی طور پر بری تھی۔ باربرا کو میں نے کتنے قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی دائیں ران کے بالائی حصے پر جو ایک کالا تل ہے اُسے میرے علاوہ کسی دوسرے نے نہیں دیکھا ہے۔ اور پھر جب اُسے خیال آتا کہ اس کا یہ راز اب راز نہیں رہا ہے تو خالد کے سارے بدن میں آگ لگ جاتی وہ تپنے لگتا۔ اسے گھٹن محسوس ہونے لگتی۔ اور پھر نفرت کا جذبہ اتنا بڑھ جاتا کہ وہ خود اس میں مجسم ہونے لگتا۔

بیئر کے بھرے ہوئے گلاس کو اس نے روشنی کی طرف اٹھا کر دیکھا صاف شفاف بیئر تھی۔ لیکن بار برا کی نئی تصویر، مکروہ شکل اور اس سے زیادہ اس کا مکروہ کیریکٹر اس گلاس میں کیسے ڈوب سکے گا۔ اس میں سے تو وہ ابھرتی چلی آئے گی۔ خیالات بھٹکتے چلے گئے۔ نفرت پھیلتی چلی گئی۔ اور بیزاری بڑھتے بڑھتے اس کا دم گھوٹنے لگی۔

"اسپین یارڈ" کے کھلے ہوئے شراب خانے میں وہ جانے کب تک کھڑا ہوا اپنے انھیں خیالات میں الجھا رہا۔ پھر ایک لمحے کے لیے جب بار برا کا تصور اس کے ذہن سے اترا تو اس نے کسی کو اونچی آواز میں "خدا کی قسم" کھاتے ہوئے سنا۔ انگریزی ماحول میں یہ لفظ عجیب سا تو ضرور لگا۔ لیکن کتنا مانوس ہے ذہن اس خدا کی قسم سے۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بائیں طرف کے کونے میں ایک مولانا کو دو ہندوستانی طالب علم گھیرے ہوئے تھے۔ مولانا کم عمر تھے۔ اور اس وقت شراب کے نشے میں ان پر اعلان حق کی کیفیت طاری تھی۔ ان کی زبان تو ضرور لڑکھڑا رہی تھی لیکن اس میں تلخی بجھے ہوئے سگار کی سی تھی۔ مولانا تقریر کیے چلے جا رہے تھے۔

"خدا کی قسم یہ داڑھی میری نہیں ہے میرے باپ کی ہے۔ خدا کی قسم یہ شرافت کا لیبل میرا نہیں ہے میرے باپ کا ہے۔ میں شریف آدمی بالکل نہیں ہوں۔ یہ لیبل میرے اوپر زبردستی لگایا گیا ہے۔ میں نے تو آج تک کسی عورت کو نیک نیتی سے نہیں دیکھا ہے میں نے ذہنی طور پر اپنے دوستوں کی بیویوں سے، ان کی لڑکیوں سے ان کی بہنوں سے کورٹ شپ کی ہے۔ ان کے شوہروں کو

پھونک سے اڑا کر ان کی بیوی کو لے بھاگا ہوں۔ لیکن ایکن میں اپنے منصوبوں کو کبھی عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اور اسی لیے لوگ مجھے شریف آدمی کہتے ہیں۔ لعنت ہے ایسے شریفوں پر"

"تم دونوں شریفے ہو دکھانے والے" ان میں سے ایک لڑکے نے اپنی دانست میں بڑی دلچسپ بات کہی اور پھر خود ہی زور زور سے ہنسنے لگا۔

مولانا کو یہ ہنسی بہت بری لگی۔ وہ ایک دم برس پڑے "بند کرو یہ بکواس" لڑکا سہم گیا۔ خاموشی پھیل گئی۔ مولانا اس دفعہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ "مجھے گناہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اب شرافت کا لیبل اس بری طرح چپک گیا ہے کہ اس کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لوگوں کو شربت پینے کی عادت ہوتی ہے۔ مجھے خشوع و خضوع سے عبادت کرنے کی لت ہے۔ یہ عادت بھی میری اپنی نہیں ہے۔ ڈالی گئی ہے۔ تھوپی گئی ہے۔ اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خدا کی عبادت کے بل بہت دیر میں ادا ہوتے ہیں۔ میں ایسا سودا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں"

"تو پھر عبادت چھوڑ کر زندگی کو از سرِ نو کیوں نہیں شروع کرتے" ایک ساتھی نے مشورہ دیا۔

"برسہا برس سجدے کر کے جانماز پر کچھ ڈھونڈتا رہا، لیکن کچھ نہ ملا۔ یہ کچھ کا لفظ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا کہ اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔ لیکن مجھے کچھ نہ ملا"

"تمہاری بیماری کا علاج شادی ہے" دوسرا مشورہ دیا گیا۔

"شادی ؟ میرے باپ نے زندگی میں عیاشی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ وہ بھی صرف ایک عورت کے ساتھ جو ان کی بیوی تھی۔ دھڑا دھڑ بچے پیدا کرتے رہے۔ اور اسی میں سے میں بھی ایک ہوں۔ میرا اکثر جی چاہا کہ ان کا گریبان پکڑ کر پوچھوں۔ میرا وجود آخر کس تقریب کے سلسلے میں ہوا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب وہ بے چارے کہاں دے پاتے۔ لیکن میں دے سکتا ہوں۔ صرف ایک لفظ میں دے سکتا ہوں۔ اور وہ لفظ ہے "عیاشی" میرا وجود کسی کی عیاشی کا نتیجہ ہے۔

خالد تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم بھول گیا۔ اُسے مولانا کی باتوں میں سچ اور دکھ کا امتزاج نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھا۔ دوسروں کی محفل میں اس طرح مداخلت کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ لیکن اس کے قدم مولانا کی طرف اٹھتے چلے گئے۔

معذرت کرتے ہوئے اس نے اپنا تعارف کرایا۔ مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر پوچھا ـــ

"کیا نام ہے ؟"

"خالد"

"مسلمان ہو"

"تھا"

"اسی بات پر ہاتھ ملاؤ" پھر اپنے دوست سے کہنے لگا۔

"ذرا اس سابق مسلمان کے لیے گلاس منگاؤ"

"اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے" اپنا گلاس دکھاتے ہوئے خالد نے کہا "ابھی تک میں نے شروع بھی نہیں کی ہے۔

"تو پھر بسم اللہ کیجیے" مولانا بولے "کیا تکلیف ہے"

"وہی جو آپ کو ہے۔ یہ شرافت کا لیبل نہیں چھٹتا"

"تو چھڑانا کیوں چاہتے ہو۔ اسی کے اوپر دوسرا لیبل لگا دو"

"لیبل سے کیا ہوتا ہے مولانا۔ بوتل تو وہی رہے گی" خالد نے نا امید ہو کر کہا۔

مولانا نے تفتیش کی "یہاں سب اپنے ہیں۔ تم چاہو تو حالِ دل کہہ سکتے ہو۔ کیا کہیں چوٹ لگی ہے"

"میری وفاداری بس یہی پریشانی ہے" خالد اپنا گلاس دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں لے کر آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔

ہم دونوں کی پہلی ملاقات بالکل اتفاقیہ ہوئی۔ پھر راہ و رسم بڑھی۔ تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ اور پھر جب دونوں ایک دوسرے پر مرنے لگے تو وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی" اس نے ایک لمبا گھونٹ لیا "مشکل صرف اتنی سی ہے کہ میں ابھی تک اُسے چھوڑ نہیں سکا ہوں"

خالد کئی دنوں سے کسی اجنبی کی تلاش میں تھا۔ جس سے وہ کھل کر باتیں کر سکے۔ اپنے ذہن کی ایسی کمزوریاں بتا سکے جن کا علم دوستوں کو مذاق اڑانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اجنبی کا کیا وہ تو پل بھر کا ساتھی ہوتا ہے۔

مولانا کافی سنجیدہ تھے "ایک بات کہوں اگر تم برا نہ مانو"
خالد "بہت سی اچھی چیزوں سے دھوکا کھا چکا ہوں۔ جب یہی پتا نہ ہو کہ کیا برا ہے اور کیا اچھا۔ تو برا ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

مولانا بولے "اس کیس میں شروع سے لے کر آخر تک تمہاری غلطی معلوم ہوتی ہے۔ تمہارا یہ جملہ بالکل غلط ہے کہ "ہم دونوں ایک دوسرے پر مرنے لگے" اس کو یوں ہونا چاہیے "ہم اس پر مرنے لگے" اگر وہ بھی تم پر مرتی تو بھاگنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ اور نمبر دو یہ کہ تم اپنا جائزہ لو کہیں نہ کہیں کوئی غلطی یا خرابی نکلے گی۔ ورنہ لڑکیاں اس طرح بھاگتی نہیں ہیں۔ اور نمبر تین۔ وہ لڑکی تمہاری بیوی تو تھی نہیں۔ صرف دوستی تھی۔ اس نے اگر دوستی جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور ختم کر دیا۔ تو اس میں رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ دوست کو بہر حال اس کی آزادی ہونا چاہیے"

"اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ شکایت جو ہے وہ اپنی وفاداری سے ہے" خالد پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"ارے گولی مارو اس وفاداری کو" مولانا نے گلاس کو منہ میں لگا کر خالی کر دیا "اور دیکھو دیو داس بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ لندن میں پاگل کو دیو داس کہتے ہیں"

مولانا کی عمر مشکل سے ۲۵ سال ہوگی۔ خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی ان پر سجتی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ ماں باپ مذہب کو ان کے حلیے کے علاوہ کہیں اور نہ سمو سکے۔ روح پیاسی رہ گئی۔ جس

کی تسکین کے لیے انہیں لندن میں آب نشاط انگیز مل گیا۔

خالد خوش تھا۔ اور اگر وہ ہیجانی صورت حال سے نہ گزر رہا ہوتا تو شاید اس نے مولانا کی بات کو اتنی اہمیت نہ دی ہوتی۔ لیکن اس وقت تو اُسے کسی ایسے مشورے کی ضرورت تھی جو خود اس کی اپنی رائے بھی ہو۔ مولانا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کہ شادی سے پہلے اتنا حق جتانا کچھ غلط بات معلوم ہوتی ہے۔

خالد اب اس محفل سے اٹھنا چاہتا تھا۔ وہ اجازت لے کر باہر نکلا۔ گھڑی پر نظر ڈالی وہ بند تھی۔ کل رات وہ گھڑی میں چابی دینا بھول گیا تھا۔ لیکن ابھی تو بہت وقت ہے اب وہ کیا کرے کہاں جائے۔ اور دل ہے کہ بیٹھا چلا جا رہا ہے۔ آنسو ہیں کہ اُمڈتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ کس سے حال دل بیان کرے۔ جانے کیوں اس کا بے اختیار رونے کو جی چاہنے لگا۔ اسے اپنی ماں بری طرح یاد آنے لگی۔ رونے کے لیے محبوبہ کی گود سے زیادہ مناسب جگہ کوئی نہیں ہوتی۔ پھر ایک دم اس پر باربرا کو دیکھنے کا جنون طاری ہوا۔ وہ صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ اب باربرا سے ملے گا نہیں۔

بجھی ہوئی آگ کو کریدنے سے کیا حاصل۔ وہ پھر بھڑک اٹھی تو کیا ہوگی۔

وہ بے مقصد اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔ دونوں ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں چھپائے وہ بڑھتا چلا گیا۔ ٹھنڈی اور

بے رحم ہوائیں تکلیف پہنچانے پر تلی رہیں۔ اس کے گرد منڈلاتی رہیں۔
لیکن وہ سب سے بے خبر سب سے بے نیاز فکر کا لبادہ اوڑھے
آگے بڑھتا رہا۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے جیب سے چار پینیاں
نکالیں۔ ٹیلیفون بوتھ میں پہنچ کر اس نے اپنی لمبی انگلی سے ڈائل
گھمانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔ کسی نے
ریسیور اٹھایا۔ خالد کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کا دل زور زور
سے دھڑکنے لگا۔ کسی نے ٹیلیفون پر 'ہلو ہلو' دو تین دفعہ کہا۔
لیکن خالد چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہلو ہلو کا جب کوئی جواب نہ ملا۔
تو دوسری طرف کسی نے ریسیور رکھ دیا۔ ٹیلی فون بند ہونے
کی آواز ایسی لگی جیسے دور کہیں میدان جنگ میں آخری گولی چلی ہو
خالد تھوڑی دیر ریسیور اپنے کانوں سے لگائے دور خلاؤں
میں دیکھتا رہا۔ جب وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا تو اس کی آنکھیں
چھلک اٹھی تھیں۔ سڑک ویران تھی۔ بند مکانوں کی کھڑکیوں کے
موٹے موٹے پردے اجالے اور اندھیرے کے درمیان فصیل بن کر
کھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی روشنی کی کوئی باغی کرن دہلیز پار کر
کے سڑک تک آگئی تھی۔ روشنی کی یہ ننھی سی لکیر فٹ پاتھ کو
ناپتی ہوئی سڑک پر بچھی ہوئی تھی۔ خالد روشنی کی اس لکیر کو
آہستہ سے پھلانگ کر تاریکی میں آگیا۔ اس کے قدموں کی آواز
سناٹے کو توڑتی رہی۔ وہ چلتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ بے مقصد۔
رات ابھی بہت باقی تھی۔ ۱۲ بجے سے پہلے گھر پہنچنے پر
بار بار سے ملامت کا ڈر تھا۔ وہ سوچنے لگا "ہر منزل کے دو

راستے ہوتے ہیں ایک لمبا راستہ اور دوسرا مختصر لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سارے مختصر راستے شراب خانے سے ہو کر گذرتے ہیں۔ یہ ملک کتنا پیارا ملک ہے جہاں ہر موڑ پر شراب خانے موجود ہیں اور جہاں شراب پینا کلچر کا ایک جزو ہے۔ جرم نہیں ہے۔ یعنی وہ اپنے پڑوس کے شراب خانے میں وقت گذارے۔ گیارہ بجے تک زندگی کی اونچ نیچ پر غور کرے اور پھر جب شراب خانہ بند ہونے لگے تو دبے پاؤں اپنے کمرے میں جاکر سو جائے۔

شراب خانہ پڑوس کے صورت آشنا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور بیئر کے پیپوں کے نل خالی گلاسوں کو بھرتے چلے جا رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ گنگنی بڑھ رہی تھی۔ خالد ایک پائنٹ وِدھ تھنگ ٹن ہاتھ میں لیے کسی خالی جگہ کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ شرقی کونے میں ایک معمر آئرش جوڑا گنس پی رہا تھا۔ خالد سوچنے لگا یہ آئرش لوگ تلخ اور سیاہ گنس کو پینا حب الوطنی کیوں سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ایک آئرش کروڑ پتی خاندان، عوام کے حب الوطنی کے جذبے سے کھیل رہا ہے۔

یہ معمر جوڑا پچھلے برسہا برس سے اسی شراب خانے میں روز شام کو آتا ہے۔ یہ جوڑا یہاں کے ہر شراب پینے والے کو نام یا صورت سے جانتا ہے۔ خالد سے ان کی ملاقات بس "ہلو" تک تھی۔ انھوں نے خالد کو اپنی میز کی طرف بلا لیا۔ خالد خاموشی سے ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ موسم کی بات ہوئی۔ ایک دوسرے کی صحت کا حال پوچھا گیا۔ اور پھر بات سیاست سے ہوتی ہوئی آئرلینڈ کے انقلاب تک پہنچ گئی۔ آئرش اور ہندوستانیوں کا مزاج بڑی حد تک ایک دوسرے سے ملتا

ہے۔ دونوں کی جنگ آزادی ایک طرح سے لڑی گئی تھی اور دونوں کا دشمن بھی ایک ہی تھا۔ اور اب بھی جب کسی انگریز کی کوئی بات ان کو ناگوار گزرتی ہے تو پچھلی تاریخ کا حوالہ دے کر یہ انگریزوں کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

خالد سیاست پر بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے ایک نیا موضوع چھیڑا۔ "آپ کی شادی کو کتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ معمر جوڑے کے چہرے پر رنگ آ گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر بڑے فخریہ انداز میں بڈھا کہنے لگا " اگلے ہفتے ہماری شادی کی پچاسویں سالگرہ ہے۔ اور اسی خوشی میں تمھیں ہمارے ساتھ شراب پینا ہوگی۔" خالد کے دماغ نے جھٹکا کھایا۔ اسے یہ معمر جوڑا بہت ہی اچھا لگنے لگا۔ پچاس سال بہت ہوتے ہیں ساتھ نبھانے کے لیے۔ لیکن معلوم نہیں ان میں سے کس نے اپنی شخصیت کی قربانی دی ہے۔ ان میں سے یقیناً کوئی ایک جیتا ہوگا۔ ہارا ہوا چہرہ کون سا ہے ان میں۔"

لیکن خالد کو دونوں چہرے ایک جیسے نظر آئے۔ جیسے بھائی بہن کے ہوتے ہیں۔ اتنے لمبے ساتھ کے بعد صورتیں بھی ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔

خالد مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا "آپ دونوں کی پہلی ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔"

بڈھا بڑی زور سے ہنسا " آج سے پچاس سال پہلے ایک دفعہ میری آنکھ میں کوئی چیز پڑ گئی تھی۔ یہ سمجھیں کہ میں آنکھ مار

مار رہا ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو ڈیوڈ" بڑھیا نے ہنستے ہوئے ڈانٹا۔

"اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آنکھ مارنے اور آپ ہی آپ پلک جھپکنے میں فرق کیا ہے۔ مجھے یاد ہے تم نے مجھے بڑے تعجب سے دیکھا تھا۔ لیکن دوسرے دن تم پھر اسی جگہ اسی وقت موجود تھیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تم سے بات کی تھی۔ اس کے بعد ہم لوگ روزانہ ایک ہی وقت پر اس اسٹور میں سودا خریدنے کے لیے آنے لگے۔ اور پھر میرا سودا بھی یہی خریدنے لگیں۔"

دونوں ایک دوسرے سے بڑی دیر تک مذاق کرتے رہے۔ پھیکے بجھے بجھے مذاق۔ ایسے مذاق جو پچیس سالہ سلور جوبلی منا چکے تھے اور گولڈن جوبلی منانے جا رہے تھے۔ ایسے مذاق جو کثرت استعمال کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکے تھے۔ جلے ہوئے پٹاخوں میں اب دھماکے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔

بڈھا کہنے لگا کہ خالد تم کو اگلے ہفتے ہماری گولڈن جوبلی میں شریک ہونا ہوگا۔ بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ خالد نے اپنے کندھے پر ایک موٹے بھاری جھریاں پڑے ہوئے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک بڈھا صحت مند انگریز پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے کوٹ کی آستین پر ایک بڑا سا چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ اور اس کے زرد مٹیالے ہونٹوں کے درمیان بھنچے ہوئے پائپ سے "ایرن مور" تمباکو کے بھبکے نکل رہے تھے۔ بڈھا انگریز ہندستانی زبان میں کہنے لگا "سلام صاحب۔ ہم کو ایک پائنٹ بیئر پلائیے گا

خالد کو اس فرمائش پر کوئی تعجب نہیں ہوا "مجھے معاف کیجیے" اس نے اس طرح کہا جیسے فقیر سے کہا جاتا ہے "معاف کرو بابا آگے جاؤ"

خالد اس آرٹش جوڑے کی طرف پھر متوجہ ہونے والا تھا کہ انگریز نے پھر کندھا پکڑا "منہ سے پائپ نکال کر کہنے لگا "تم بہت بڑا کالا صاحب ہے"

"لیکن تم بہت چھوٹا گورا صاحب ہے" خالد کا چہرہ سرخ تھا اور آواز اتنی اونچی تھی کہ بہت سے لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اپنے گلاسوں میں اُلجھ گئے۔

بڈھا انگریز "سلام صاحب، سلام صاحب" کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ لیکن اس کے انداز میں طنز تھا۔

آئرش جوڑا بڑے تعجب سے ہندوستانی گفتگو کو سن رہا تھا۔ خالد نے ان کے سوالیہ چہروں کو دیکھ کر غلط فہمی دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور پھر انگریزی راج کی تلخیاں اُبھر آئیں۔ اس نے اپنے منہ میں کڑواہٹ محسوس کی۔ وہ کہنے لگا۔

"فیکٹریوں میں کام کرنے والے عام انگریز اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ ان کو گلے لگا لینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھو ہندوستانی زبان بولنے والا ہر انگریز قاتل ہوتا ہے۔ اس نے اپنی جوانی کے دن ہندوستان کی جنگ آزادی کو کچلنے میں صرف کیے ہوتے ہیں۔ یہی بڈھا جو ابھی بھیک مانگنے آیا تھا ہندوستان میں ہمارے ہر سوال کا ہماری ہر مانگ کا جواب ٹامی گن سے

دیا کرتا تھا۔ کوئی ہندوستانی خاندان ایسا نہیں ہوگا جس کا کوئی نہ کوئی فرد ان کے ہاتھوں تباہ نہ ہوا ہو۔ اور اسی لیے مجھے ہر اس انگریز سے نفرت ہے جو ہماری زبان جانتا ہے۔ ہندوستانی بولنے والا انگریز چاہے بھکاری ہو۔ یا شاہی خاندان کا ہو، مجھے خونی نظر آتا ہے۔

آئرشش جوڑا بڑے غور سے سنتا رہا۔ ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اور پھر خاموش ہو کر شاید آئرلینڈ کی تاریخ کے اوراق دہرانے لگا۔ خالد خاموشی سے اٹھا۔ اور گینس کی دو بوتلیں لا کر میز پر رکھ دیں۔ کہنے لگا "اگلے ہفتے کی گولڈن جوبلی کے لیے یہ تحفہ قبول کیجیے۔ گڈ نائٹ۔"

شراب خانے میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ لیکن ابھی بند ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ لوگوں کی آوازیں بہت اونچی ہوگئی تھیں۔ سگریٹوں کے دھوئیں نے ہر چیز کو دھندلا دیا تھا۔ اور بیئر کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ باہر نکل کر اس نے کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں لیں۔ سڑک کشادہ تھی۔ اُسے اپنا گھر سامنے نظر آ رہا تھا۔ ایک ٹیکسی رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی جس کی سُرخ روشنی اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر جھانک رہی تھی۔

بڈھے جان کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ باربرا شاید سو چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بے مقصد سڑک پر گھومتا رہا۔ جب اور وقت گزر گیا تو خالد دبے پاؤں اپنے گھر کی طرف بڑھا۔

اگر باربرا سے ملاقات ہو گئی تو وہ صاف صاف کہدے گا۔
"باربرا مجھے افسوس ہے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا"۔ باربرا کی طرف سے خود ہی سوال کرتا خود ہی جواب دیتا اور پھر خود ہی خفا ہو جاتا۔ وہ بڑھتا چلا گیا۔ دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ پنجوں کے بل چلنے والا انسان چور ہوتا ہے۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے میں نے کوئی ڈاکا نہیں ڈالا ہے۔ میں تو وہ ہوں جو دھوکا کھانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ تو پھر میں پنجوں کے بل کیوں چلوں۔

زینے ختم ہو گئے۔ باربرا کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ جان کے کمرے سے بجلی کا بٹن دبنے کی آواز ابھری، دراڑوں نے آنکھیں پھاڑ کر گھورنا شروع کر دیا۔ اس نے جان کے دروازے پر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔

خالد نے اپنے کمرے کے تالے میں چابی گھمائی۔ بجلی کے بٹن پر ہاتھ رکھا تو سارا کمرہ روشن ہو گیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایش ٹرے میں ابھی تک آدھا جلا ہوا سگار احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ اس کے سرے پر لمبی سی راکھ اب تک سالم تھی۔

سوٹ پہنے پہنے وہ اپنی آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ بائیں ہاتھ کو اسٹینڈ بنا کر اس نے اپنا مغموم اور اداس چہرہ اس طرح رکھ دیا کہ ہاتھ کی دو انگلیوں پر پیشانی تھی اور

انگوٹھا ٹھوڑی کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ آنکھیں بند کر کے ابھی وہ اپنے ذہن کے دروازے کھولنے بھی نہیں پایا تھا کہ بڈھا جان دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

خالد ایک دم چونک کر کھڑا ہو گیا "جان سب خیریت ہے؟" — "ہاں میں خیریت سے ہوں۔ شکریہ۔ لیکن تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تمھیں کم از کم مجھ سے مشورہ تو لینا چاہیے۔ میں عمر میں تمھارے باپ سے بھی بڑا ہوں"

خالد نے اپنے ٹھیک ہونے کا لاکھ یقین دلایا لیکن بڈھے جان کو سب کچھ معلوم تھا۔ خالد کی ایب نارمل زندگی اس کے چہرے کی وحشت سب راز کھولے دے رہی تھی۔ اس کی بے ہنگم زندگی چلا چلا کر کہہ رہی تھی "کہیں کسی جگہ جسم کے کسی حصّے میں کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے"

وہ تمھارے پاس اپنی بے گناہی کے سرٹیفکیٹ لے کر آئی ہوگی۔ یہ لڑائی کی بات کس نے کہی تم سے؟"

"مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ یہی تو شکایت ہے۔ میں بالکل تمھیں اپنا بیٹا سمجھنے لگا تھا۔ اور یقین رکھو خالد اگر مجھ سے مشورہ لیا گیا ہوتا تو میں اُسے یہاں سے ہرگز جانے نہ دیتا"

"کیا باربرا یہاں سے چلی گئی ہے" خالد نے تعجب سے پوچھا اس کے لہجے میں پریشانی بھی تھی۔

"بہت دن ہو گئے اس کو یہ گھر چھوڑے ہوئے"

"لیکن جان تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ کب چھوڑا اس نے

یہ گھر"

"مجھے تو آج پتا چلا۔ لینڈ لیڈی کا حساب کرنے کے لیے آندرے آیا تھا"

"پھر وہ مجھ سے ملنے بھی آیا"

"تم نے اس کمینے کے منہ پر تھپڑ نہیں مارا" خالد کا ٹمپریچر پھر بڑھنے لگا۔

"وہ یہ کہنے آیا تھا کہ باربرا کی طبیعت خراب ہے اور تھوڑے دنوں کے لیے وہ آرام کرنے جا رہی ہے"

"اور یہ آرام اُسے صرف آندرے پہنچا سکتا ہے" وہ چلّایا "اس سے کہدو کہ میری زندگی کو تباہ کرکے اُسے آرام نہیں ملے گا"

"خالد تم باربرا سے کیوں لڑ لیے۔ وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے" خالد کو جیسے کسی نے چٹکی لے لی ہو۔ وہ بڈھے جان کے اعتماد کو کسی قیمت پر ختم نہیں ہونے دے گا۔ وہ جوش میں اُبل پڑا۔

"جان تمھاری لڑکی ہیلن اور باربرا اسمتھ میں بہت بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا فرق جس کا تم اندازہ نہیں کرسکتے ہو۔ تم یقین جانو میں اور کرشن، یعنی خالد اور کرشن ایک ہیں۔ بالکل ایک ہیں۔ لیکن ہیلن اور باربرا ایک نہیں ہیں"

"تمھیں جلدی نہ کرنا چاہیے۔ تھوڑا موقع دیا ہوتا" جان نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جان جلدی میں نے نہیں کی۔ جلدی اس کو تھی۔ اس کو

تھی جلدی جان ۔ ہیلن کا پیار امر تھا۔ کرشن کے مرنے کے بعد اس نے کسی دوسرے مرد کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ زہر کھا لیا تھا یاد ہے جان۔ لیکن باربرا اسمتھ نے محبت کی پہلی منزل میں کسی دوسرے کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔ باربرا کو تجربوں کا شوق ہے تجربوں کا؟!

بڈھا جان خاموشی سے خالد کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ خالد کی باتوں کا جواب کیا دے۔

خالد نے وقتی خاموشی کو پھر توڑا "جان اچھا ہوا جو اس نے اس دوستی کا خود اپنے ہی ہاتھوں گلا گھونٹ دیا۔ میں اب کھلی فضا میں سانس تو لے سکتا ہوں۔"

خالد کے دل کی بھڑاس نکلی تو اس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ لیکن بڈھا جان یہ سوچ رہا تھا کہ باربرا کی طبیعت واقعی خراب بھی تو ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنا شبہ ظاہر کیا "لیکن خالد آندرے کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے وہ آرام کرنے جا رہی ہے۔"

"لیکن جان شاید تم بھول گئے ہو۔ آندرے کے سینے سے لگ کر رقص کرتے ہوئے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ پھر آندرے اس کو علاج کے لیے اپنے فلیٹ پر لے گیا تھا پھر بیماری کی تیمارداری کے لیے آندرے اس کے ساتھ رہنے لگا تھا ـــــ بے وفائی کی کتنی مختصر سی کہانی ہے۔" خالد پورے اعتماد اور یقین سے بول رہا تھا ■

زخم پھر لگا رِ کھلنے

بے وفائی کی یہ مختصر سی کہانی جونک کی طرح خالد کے جسم سے چمٹ گئی۔ اپنے کام اور گھر کے علاوہ اس نے سارے رشتے ناتے توڑ دیے۔ بس ایک بڈھا جان تھا جو وقتاً فوقتاً آکر اُسے تسکین دیتا رہتا۔ زندگی کے اس خلا نے اس کے اندر ایک اختلاجی کیفیت پیدا کر دی۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ بھاگ کر سڑک پر آجاتا۔ اور پھر سڑکوں پر بے مقصد گھومتے گھومتے وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگتا۔

لندن میں چاند کبھی نہیں نکلتا۔ اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی چادر پر ستارے کبھی نہیں جھلملاتے آسمان کے نیلے رنگ کو یہاں کی لڑکیوں نے چرا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لیا ہے۔ اسی لیے میلا میلا سا آسمان اتنا بے کیف ہوتا ہے کہ سر اٹھا کر ٹھنڈی آہ بھرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اگر سورج نکلنے کا نام دن ہے تو پھر یہاں دن مہینوں نہیں نکلتا صرف شام ہوتی ہے یا رات آتی ہے۔ آج کا دن بہت سرد ہے۔ ہوا کی خشکی بتا رہی ہے کہ برف گرے گی لیکن سڑکوں

کی چہل پہل ہے کہ اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ریجنٹ اسٹریٹ کی اونچی دکانوں میں عام آدمی کا گزر نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان دکانوں کی شو ونڈوز بڑے اہتمام سے سجائی جاتی ہیں۔ اور سڑکوں پر گھومنے والی مخلوق ان کے بشیشوں پر ناکیں چپکا کر رال ٹپکاتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ اس شہر کو دنیا کی سینکڑوں قوموں نے مل کر بسایا ہے۔ جہاں مہمانوں کی کثرت نے میزبانوں کو روپوشی پر مجبور کر دیا ہے۔ چہل پہل آج ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ کالے سوٹ پہنے ہوئے لوگ اور اوورکوٹ میں لپٹی ہوئی لڑکیاں اس ماحول میں بجتی ہیں۔ طرح طرح کی زبانیں بولنے والے طرح طرح کے لوگ بڑی معروفیت سے آجا رہے ہیں۔ اور ان میں اگر انگریز نظر آتا بھی ہے تو خاموش۔ سارے آداب کو برتتا ہوا۔ نہ کسی سے کچھ لینا اور نہ کسی کو کچھ دینا۔ جیسے خود اپنے گھر میں مہمان آیا ہو۔ برنارڈ شا نے کہا تھا "انگریز ہر کام کرتا ہے۔ لیکن وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرتا۔ وہ آپ سے جنگ پر آمادہ ہو جائے گا لیکن حب الوطنی کے اصول کے تحت، وہ آپ کو لوٹ لے گا لیکن تجارتی اصول کے تحت اور وہ آپ کو غلام بنا لے گا لیکن امپیریل قانون کے تحت"۔

سامنے فٹ پاتھ پر ایک ہندوستانی لڑکا شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں اتراتا پھر رہا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس ملک میں یہ پاجامہ صرف رات کا لباس سمجھا جاتا

ہے۔ گھر کے باہر یہ لباس صرف ان لوگوں پر اچھا لگتا ہے جن کی شخصیت اور شہرت کا ایک بہت بڑا ہالہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ یہ لڑکا نو وارد ہے تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی شیروانی بکس کی تہہ میں کھو جائے گی۔

خالد بس یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ کبھی ایک شو ونڈو کے پاس کھڑا ہو جاتا کبھی دوسری کو جھانکنے لگتا۔ ان سجی ہوئی کھڑکیوں کو دیکھ کر ایک عجیب طرح کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ جس میں مستقبل کے منصوبے جنم لینے لگتے ہیں۔

ایک بہت پیاری سی لڑکی۔ کھوئی کھوئی۔ بے نیاز ایک لباس کو تک رہی ہے۔ خالد کو ایک دم ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس لڑکی کو کہیں دیکھ چکا ہے۔ لڑکی میں ایک جاذبیت تھی۔ حسن بے پروا تھا جو ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کیے لے رہا تھا۔ خالد بھی آہستہ سے بڑھ کر اسی شو ونڈو کے پاس کھڑا ہو گیا پہلے تو لڑکی کو کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا لیکن جب خالد نے اسے گھورنا شروع کیا تو وہ گھبرا گئی۔ خالد کو اب یقین ہو چکا تھا کہ یہ مارگریٹ ہے۔ اس نے آہستہ سے پکارا "مارگریٹ"

مارگریٹ نے مڑ کر پکارنے والے کو غور سے دیکھا وہ اب بھی خالد کو پہچان نہ سکی۔ خالد کے دل پر ایک اور چوٹ لگی۔ یہ وہی لڑکی ہے جو اس کے ذہن پر کئی دن کئی ہفتے بلکہ کئی مہینے طاری رہی تھی۔ خالد کا جی چاہا کہ وہ صرف اتنا کہہ کر آگے

بڑھ جائے۔" معاف کیجیے گا غلط فہمی ہو گئی تھی" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنا تعارف کرا رہا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ صرف چند لمحے گزارے ہیں لیکن میں نے اپنا بہت سا وقت آپ کی نذر کیا ہے۔ اسی لیے شاید آپ مجھ سے اتنا واقف نہیں ہیں جتنا میں آپ سے واقف ہوں۔ یاد ہیں آپ کو چاندی کی وہ بالیاں"

"او ــــ خالد تم ہو ــــ کتنے بدل گئے ہو" مارگریٹ کے ذہن میں تصویریں ابھرنے لگیں۔

"ایک عمر گزر گئی ہے آپ سے ملے ہوئے۔ کیا آپ اب بھی لڑکوں کو نچاتی ہیں کلبرن کے ڈانس ہال میں"

"ہاں وہ تو میرا پیشہ ہے۔ ویسے یہ بتاؤ تم کو کوئی گرل فرینڈ ملی یا نہیں؟" مارگریٹ نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

خالد کو اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی "اور آپ کو رائل فیملی کا کوئی شہزادہ ملا"

"خفا ہونے کی بات نہیں ہے۔ میں نے تو صرف ہمدردی کے خیال سے پوچھا تھا" مارگریٹ نے وضاحت کی۔

خالد کو دکھ جھیلنے میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی، جتنی کسی کی ہمدردی سے۔ وہ اپنی خوشیوں میں تو لوگوں کی شرکت گوارا کر لیتا ہے لیکن دکھوں میں اُسے تنہا ہونا چاہیے۔ بالکل اکیلا ہونا چاہیے۔" ایک وقت تھا جب میرا خیال تھا کہ میں مارگریٹ کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ پھر میں سمجھا کہ میں باربرا کے بغیر

ایک پل نہ جی سکوں گا۔ اور اب ایسا لگتا ہے کہ ان سب کے بغیر جیا جا سکتا ہے۔ مارگریٹ میں اس وقت بہت ناسمجھ اور بہت ناتجربہ کار تھا۔"

مارگریٹ نے ایک قہقہہ لگایا۔ جس کا مطلب تھا کہ تم اب بھی بے وقوف ناتجربہ کار جذباتی جانور ہو۔ پھر وہ بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی "خالد تجربہ کار کس کو کہتے ہیں اور ناتجربہ کار کون ہوتا ہے۔ میں ایک مدت تک اپنے کو بہت سمجھدار ہوشمند اور تجربہ کار سمجھتی رہی۔ لیکن میرے تجربوں نے مجھکو سنکی بنادیا ہے۔ تو کرانسٹ کے لیے تم اپنے کو تجربہ کار نہ کہنا۔"

"اس وقت کتنے بجے ہیں مارگریٹ" خالد نے کچھ سوچ کر بات کاٹی۔

مارگریٹ نے کلائی پر نظر ڈالی "ساڑھے پانچ بجے ہیں۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ آج پھر تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔ اگر تمہارے پاس بھی وقت ہو تو شراب خانے کھل چکے ہیں۔ ہم لوگ تھوڑی دیر ساتھ رہیں۔"

"مجھے امید تھی کہ تم یہی بات کرو گے۔ تم ہندوستانی دو گلاس بیئر پی کر بہک جاتے ہو۔ تم سب کے سب نشے کی خاطر شراب کیوں پیتے ہو۔ میں بتاؤں دو گلاس بیئر پینے کے بعد تم کیا پوچھو گے؟"

خالد کہنے لگا "ہاں بتاؤ میں کیا پوچھوں گا۔"

"تم پوچھو گے کہ آپ ہندوستانی کھانا پسند کرتی ہیں۔

میں کہوں گی "ہاں" تو تم کہو گے "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے گھر چلیے۔ میں خود پکا کر آپ کو کھلاؤں گا۔ وہاں تم شراب کی بوتلیں نکال کر سامنے رکھ دو گے۔ میں احتیاط سے پینا چاہوں گی تم اصرار سے پلانا چاہو گے۔ دو تین گلاس حلق میں انڈیلنے کے بعد تم پر عشق کا دورہ پڑے گا۔ تم سوچو گے کہ مجھے دیر ہوتی چلی جائے سرور آتا چلا جائے اور پھر سب سے آخر میں تم دست درازیاں شروع کر دو گے۔"

مارگریٹ نے ایک سانس میں خالد کے ذہن کا مکمل جائزہ لے ڈالا۔ جیسے کوئی بند ڈبا کھول کر میز پر الٹ دے۔

لیکن مارگریٹ کا یہ اندازہ بالکل غلط نکلا۔ خالد حیرانی سے مارگریٹ کا منہ تکتا رہا۔ اتنی حق گوئی کسی بہت بڑے سانحہ کا پتا دے رہی تھی۔ "مارگریٹ اب مجھے تمھارے عشق کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ میں جب تم سے ملا تھا تو تم ایک دیوی کی طرح معصوم لگ رہی تھیں۔ آج اتنے دنوں کے بعد وہ عقیدت ایک دفعہ پھر جاگی ہے۔ لیکن چرنوں میں گر جلنے والا جذبہ اب سو چکا ہے مر چکا ہے۔"

"میں اس وقت معصوم تھی یا نہیں۔ لیکن تم میں ایک معصومیت ضرور تھی اور میرا خیال ہے کہ اب تم اس معصومیت کو کھو چکے ہو۔"

خالد نے بات کاٹنا چاہی "یہ بتاؤ کہ تمھارے پاس وقت ہے یا نہیں۔"

"وقت تو سارے کا سارا گزر چکا ہے۔ اب جو بچا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جس کا جی چاہے لوٹ لے۔ میرا اس سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔"

خالد کو یہ سن کر دکھ ہوا۔ بہت دن ہوئے مارگریٹ سے جدا ہو کر اس نے سوچا تھا کہ مارگریٹ اب کسی بڑے سے عالی شان محل میں راج کر رہی ہوگی۔ پیار کرنے والا شوہر اور پسند کرنے والوں کی پلٹن ہوگی۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی طوفان اٹھا تھا جو آن کی آن میں ویرانیاں، اداسیاں اور تنہائیاں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ اس نے مارگریٹ کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا۔ لیکن مارگریٹ اب بہت بدل چکی تھی۔ اُسے شراب پیتا ہوا انسان دم دبا کر بھاگتے ہوئے آدمی کی طرح نظر آنے لگا ہے۔ کلبوں کی زندگی کا کھوکھلا پن اب ایسی بھیانک آوازیں نکالتا ہے کہ اس کے کان پھٹنے لگتے ہیں۔ مارگریٹ کہنے لگی "خالد آج تم میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو ایک نئی جگہ لے جاؤں گی۔ میرا خیال ہے کہ تم کو پسند آئے گی وہ جگہ۔"

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ غالباً وہ دونوں اس وقت کچھ نہیں سوچ رہے تھے۔

ایک چوراہے پر ریجنٹ اسٹریٹ، آکسفورڈ اسٹریٹ سے آکر مل جاتی ہے۔ اس کے پیچھے کی ایک گلی میں چھوٹے سے ایک دروازے کے سامنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا مجمع لگا ہوا ہے۔ لڑکیاں کسی ہوئی پتلونوں پر چست جرسیاں پہنے ہوئے بہت اسمارٹ

لگ رہی ہیں۔ کٹے ہوئے بال، چال میں بے اعتنائی۔ اور مزاج میں لا اُبالی پن۔ ان کی انفرادیت ہے۔ کچھ لڑکوں کے ہاتھ میں اخبار اور کچھ کے ہاتھ میں گٹار ہے۔ لڑکوں کے بال لڑکیوں سے بڑے ہیں جس کی وجہ سے ماحول کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔

خالد کو تعجب ہوا کہ مارگریٹ جو کسی بڑے گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے اس قدر تبدیل کیوں اور کیسے ہو گئی ہے۔ آخر مارگریٹ نے خاموشی توڑی "میں نے لوگوں کو اسٹیشن پر لگی ہوئی سلاٹ مشین سے ٹکٹ نکالنے پر مشین : کا شکریہ ادا کرتے سنا ہے۔ یہ پارٹیزان کیفے مجھے اسی لیے پسند ہے کہ یہاں بات بات پر تھینک یو نہیں کہا جاتا۔ یہاں وہ لوگ آتے ہیں جو باہر کے انتشار میں اپنے کو گم نہیں کر پاتے۔ اس کیفے میں سب ایک برادری کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں اگر بنچیں نہ خالی ہوں تو لوگ زمین پر بیٹھ کر چائے پی لیتے ہیں۔ اور شطرنج کھیلتے ہیں تو شطرنج کی بساط پر، زندگی کی بساط ان کو راس نہیں آتی۔"

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں زینے اترنے لگے۔ اندر دھواں اتنا تھا کہ خالد کی آنکھیں جل اٹھیں۔ کئی لوگوں نے مارگریٹ کو دور ہی سے ہلو کیا۔ ایک طرف گٹار کی دھن پر رقص ہو رہا تھا۔ دوسری طرف کسی موضوع پر زوردار بحث چھڑی ہوئی تھی۔ زینوں پر بیٹھے ہوئے نوجوان لڑکے اور پاؤڈر اور لپ اسٹک سے بے نیاز لڑکیاں کافی کے گلاس ہاتھوں میں لیے اپنے مسائل سلجھا رہی تھیں۔ ایک اور گروپ میں کچھ لڑکیاں لڑکوں کی گود میں بیٹھی تھیں۔

ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت تھی۔ مارگریٹ خالد کو ایک کونے میں بٹھا کر کہنے لگی کہ میں ابھی آتی ہوں تم انتظار کرنا۔"

خالد بیٹھے بیٹھے کیبنے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ اتنے میں مارگریٹ کافی کے دو لبریز گلاس لیے ہوئے ٹکڑوں سے بچتی ہوئی مسکراتی ہوئی۔ سگریٹ پیتی ہوئی آگئی۔ گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ اب کہو خالد کیا کہنا چاہتے ہو۔"

خالد ابھی تک کمرے کا جائزہ لے رہا تھا "اچھی جگہ ہے"

"ہاں مجھے پسند ہے۔ شکر ہے کہ تم کو بھی پسند آئی۔ یہاں میں تمہارے دوست آنند سے بھی ملی ہوں۔"

"اچھا تو تمہاری ملاقات آنند سے ہو چکی ہے۔" خالد کو تعجب ہوا۔

"ہاں یہاں وہ اکثر آتا ہے۔ تنہائی کے مسئلہ پر ڈاکٹریٹ کر رہا ہے۔" دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

"اچھا خالد اتنے دن تک تم کیا کرتے رہے۔"

"میں عشق کرتا رہا۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ وہ بھی مجھ سے عشق کرتی ہے۔ لیکن پھر ایک دن وہ لڑکی مجھے دھوکا دے کر چلی گئی۔ بس اسی دن سے، اپنی وفاداری اور اس کی بے وفائی کا گلا شروع کر دیا ہے۔ جو آج تک جاری ہے۔"

"کبھی یہ سوچا کہ اس نے بے وفائی کیوں کی۔ ہو سکتا ہے کہ بیچ میں غلط فہمیاں ہوں" مارگریٹ نے مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"بیچ میں غلط فہمیاں نہیں حائل تھیں" اندر سے حائل تھا مارگریٹ تجربے کرنا اچھی بات ہوتی ہے۔ اگر ان سے سبق لیا جائے تو جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ لیکن مجھے ایسی لڑکیاں ہرگز پسند نہیں ہیں جو ان تجربوں میں اپنا سب کچھ لٹا دیں۔ خیر چھوڑو اس قصے کو تم اپنی سناؤ۔ تمہارے حسن پر ابھی تک زوال کے آثار نہیں دکھائی دیتے"

"ہاں یہ عجیب بات ہے۔ میں پچھلے دنوں جن حالات سے گزری ہوں۔ وہ کسی بھی لڑکی کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھے" مارگریٹ بہت سنجیدہ تھی۔

"کیا تم بھی کہیں دھوکا کھا گئیں"

مارگریٹ نے خالد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ سوچتے ہوئے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتی رہی۔ پھر کہنے لگی "خالد آج میں بیوہ ہو گئی ہوں"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" خالد کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"نہیں میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ خالد بہت دن ہوئے اُسی کلب کے ڈانس ہال میں میرے پاس ایک بہت خوبصورت بہت دلچسپ اور بہت دولت مند لڑکا

ڈانس کے سبق لینے کے لیے آیا۔ مجھے پہلے ہی دن اندازہ ہو گیا کہ اسے ڈانس کرنا آتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا کہنے لگا "ہر خوبصورت چیز میرے مزاج میں " میری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے" اور یہ کہتے ہوئے وہ لڑکا میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر کچھ دن گزر گئے۔ وہ مجھ سے روز ملنے لگا۔ میرے لیے تحفے لانے لگا۔ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر بڑے بڑے ریستورانوں میں کھانے کھلانے لگا۔ مختصر یہ کہ میرے تعلقات اس سے بہت بڑھ گئے۔ میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو۔ تمھاری تعلیم کیا ہے۔ تمھارا خاندان کونسا ہے۔ میں تو بس اندھی ہو گئی تھی۔ ایک دن میں بیس پاؤنڈ ہفتہ کے شاندار فلیٹ میں اس کے ساتھ لیٹی ہوئی اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی کہ اس نے شادی کی تجویز رکھ دی۔ میرے مزاج میں تم کسی حد تک واقف ہو۔ میں فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں ضائع کرتی ہوں۔ جیسے کوئی سکہ اچھال کر ٹاس کرے۔ میں نے کہا کہ ایک شرط پر میں تم سے شادی کر سکتی ہوں" اس ایک لمحے میں اس نے جانے کیا کچھ سوچ ڈالا ہوگا۔ کہنے لگا کہ مجھے تمھاری ہر شرط منظور ہے"

اس کے جواب نے میری رہی سہی قوت فیصلہ بھی ضائع کر دی۔ میں نے کہا "شرط یہ ہے کہ ہم لوگ کل ہی شادی کریں گے"

چنانچہ دوسرے دن ہم لوگوں کی شادی ہوگئی۔

خالد مجھے ایسا لگا جیسے میرا جیون سپھل ہو گیا ہو۔ جیسے میرے پچھلے جنم کی کوئی نیکی کام آگئی ہو۔ جیسے لندن کی سب سے زیادہ سکھی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی میں ہوں۔ گھر میں پیسے کی کمی نہیں تھی۔ پیار کا اتنا بہت سا ڈھیر تھا جسے ختم کرنے کے لیے دو زندگیاں کافی ہوں۔ خدا کی اتنی مہربانیوں سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں رشوت دینے پر اتر آئی۔ باقاعدگی سے چرچ جانے لگی۔ کرائسٹ کی بڑی سی تصویر میرے گھر میں آگئی۔"

مارگریٹ ایک لمحے کے لیے رکی پھر پوچھنے لگی "خالد کل تم نے اخبار دیکھا تھا؟"

"ہاں دیکھا تھا ـــ کیوں؟"

"کل جو بینک پر ڈاکہ ڈالنے کی خبر تھی۔ وہ میرے شوہر نے ڈالا تھا۔ لیکن مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب اخباری نمائندوں اور پریس فوٹو گرافروں نے میرے گھر آکر مجھے گھیر لیا۔ تم یقین جانو۔ اس لمحے میرے پیار اور میری محبت نے انتہائی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔ چوہوں کی طرح پنشن کی امید میں جینے والوں سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میرے شوہر نے کام برا ضرور کیا تھا مگر وہ دوسروں سے مختلف تھا اور ایسا کام تھا جس میں زیادہ مردانگی اور زیادہ بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُسے دو سال کی سزا ہو گئی۔ اس نے کہا تھا کہ تم میرا انتظار کرنا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اس کا انتظار کروں گی۔

چاہیے اس انتظار میں میری زندگی تمام ہو جائے۔ لیکن یہ انتظار ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ کل ایک خوبصورت عورت مجھ سے ملنے کے لیے گھر پر آئی۔ وہ عورت بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ جیسے اس نے زندگی میں بہت دکھ جھیلے ہوں۔ وہ پوچھنے لگی "مارگریٹ تمھارا نام ہے؟" میں نے کہا کہ ہاں میرا نام ہے۔ یہ سن کر اس نے کچھ کہنے سے پہلے دو بہت زوردار طمانچے میرے گالوں پر لگا دیئے۔ طمانچے کھا کر مجھے غصہ بالکل نہیں آیا۔ اور نہ میں نے جواب دینے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ کہیں کوئی چیز غلط پڑ گیا ہے۔ وہ کہنے لگی "تم نے آرتھر سے شادی کر لی ہے" میں نے بڑے اعتماد سے کہا کہ ہاں کر لی ہے لیکن ان طمانچوں کا میری شادی سے کیا واسطہ ہے۔ وہ بولی "واسطہ ہے۔ تمھارے شوہر کا نام آرتھر نہیں آرنلڈ ہے۔ آرنلڈ کی بیوی میں ہوں۔ اور یہ بچہ" اس کے ساتھ ایک بچہ تھا جسے گھسیٹ کر اس نے میرے سامنے کر دیا "اس کی صورت دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ یہ ہم دونوں کا ہے۔ ہم دونوں کی نہ تو طلاق ہوئی ہے اور نہ ہونے والی ہے"

میری آنکھوں میں پہلی دفعہ۔ برسہا برس کے بعد پہلی دفعہ آنسو آ گئے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ اس کھیل میں میں ہار گئی ہوں" مارگریٹ نے ایک نئی سگریٹ جلانے کے لئے ماچس مانگی۔ ماچس دیتے ہوئے خالد کہنے لگا "پھر تم نے کچھ کہا نہیں"

"میں نے صرف ایک بات کی۔ اپنی شکست مان لی۔ غلطی میری تھی" ماچس کی تیلی ایک رگڑ سے بھڑک اٹھی تھی۔

"خالد میں نے پہلے سوچا تھا کہ آرتھر دنیا کا سب سے زیادہ اچھا محبوب ہے۔ پھر میری شادی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ وہ سب سے زیادہ اچھا شوہر ہے پھر وہ جیل چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ سب سے زیادہ بہادر مرد ہے۔ اور آج جب کہ میرے دونوں گالوں میں، اب بھی طمانچوں کی جلن ہے" میں سوچ رہی ہوں کہ مرد اس دھرتی کا سب سے گھٹیا جانور ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے چھت کو دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

"جب میں نے ڈاکے کی خبر سنی تھی تو مجھے خیال ہوا تھا کہ آرتھر میں صلاحیتیں ہیں۔ میں اُسے سُدھار لوں گی۔ لیکن اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عادی مجرم ہے اور عادی مجرموں کو سدھارنے کے لیے کسی فرد کی ضرورت نہیں ہوتی اوارے کی ضرورت ہوتی ہے"

خالد اپنے سارے غم بھول گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ہر آدمی اُس وقت تک اپنے کو سب سے زیادہ دکھی سب سے زیادہ مظلوم سمجھتا ہے جب تک وہ کسی دوسرے کے دل کا حال نہیں جانتا۔ وہ ہمدردی کرنا چاہتا تھا مگر کہاں سے شروع کرے۔ ہمدردی کے جملوں میں کتنا تصنع ہوتا ہے۔ چاہے وہ دل ہی سے کیوں نہ نکلیں۔

مارگریٹ کہنے لگی "خالد مجھے اب کوئی دکھ نہیں ہے۔

دکھ تو اس وقت تک ہوتا ہے جب تک آدمی کسی کو سمجھ نہ پائے۔ جب کسی کی کمزوریاں معلوم ہو جائیں تو پھر شکایتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا جواز مل جاتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر شطرنج کے کھلاڑی اپنے پٹے ہوئے مہروں کے غم میں لگ جائیں تو پھر اگلی بازیاں جیتنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔"

"لیکن مارگریٹ دکھوں کا کوئی انت نہیں ہے۔ ایک سے دوسرے کا سلسلہ کچھ اس طرح ملتا ہے کہ کچھ پتا نہیں چلنے پاتا بیچ بیچ میں خوشیاں آتی بھی ہیں تو دھوپ میں ابر کے سائے کی طرح جنھیں ایک لمحہ قرار نہیں ہوتا۔"

مارگریٹ موضوع کو بدلنا چاہتی تھی کہنے لگی "خالد یہ بتاؤ آنند کیسا آدمی ہے؟"

آنند پانی کا وہ قطرہ ہے جس کے لیے کسی سیپ کا منہ نہ کھل سکا۔ وہ جو نہ بن سکا۔ اس میں اس کی غلطی نہیں ہے۔ اور جو کچھ بن سکا ہے اس میں اس کا کمال ہے۔"

"ایک بات اور بتاؤں؟"

"ہاں بتاؤ۔"

خالد "ناستک آنند اتنا خوبصورت ہے جیسے کتابوں میں مذہب ہوتا ہے۔"

مارگریٹ نے بھی آنند کے بارے میں کچھ اسی قسم کی رائے قائم کی تھی۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی تہہ میں کوئی دکھ چھپا ہوا ہے۔ وہ کہنے لگی "آنند چوٹیں کھایا ہوا

آدمی لگتا ہے۔ وہ کچھ پریشان بھی تھا اس دن "

"پریشان تو وہ اکثر رہتا ہے لیکن دوسروں کی خاطر۔ اس کے ذہن پر لندن اسکول آف اکنامکس کا ایک لڑکا چھایا ہوا ہے۔"

خالد نے بات یہیں ختم کرنا چاہی تھی لیکن مارگریٹ کو تشویش ہوئی پوچھنے لگی "اس لڑکے کا کیا پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ اُسے رات میں نیند نہیں آتی۔ اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اُس نے کوئی دوا دی۔ جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ چنانچہ شکایت لے کر یہ پھر اس کے پاس پہنچا۔ اس دفعہ ڈاکٹر نے اور زیادہ تیز دوا دی۔ لیکن یہ نسخہ بھی کارگر نہ ہوا۔ آخر ڈاکٹر نے اس لڑکے کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پتا چلا کہ پچھلے ۲۵ سال میں، یعنی پیدائش سے آج تک اس نے کسی لڑکی کا ہاتھ تک نہیں پکڑا ہے۔ لیکن جب سے سن بلوغ کو پہنچا ہے۔ اِسی امید کے سہارے جی رہا ہے کہ کبھی کہیں، کسی جگہ کوئی لڑکی اُسے ایسی ضرور ملے گی جو اس کے عشق میں دیوانی ہو جائے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر نے پوری سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ تم شادی کر لو۔ اور یا پھر کوئی گرل فرینڈ تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تمھاری محفل میں تمھارے اردگرد لڑکیاں ہوں تو پھر تم نارمل ہو جاؤ گے اور نیند بھی آنے لگے گی۔ ڈاکٹر کا یہ مشورہ بھی بے کار گیا۔ کیونکہ لڑکے میں اکنامکس کے بڑے بڑے مسائل حل کرنے کی تو صلاحیت تھی لیکن گرل فرینڈ تلاش کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب ڈاکٹر نے ضروری سمجھا کہ وہ اس لڑکے کو کسی ایسی عورت کے پاس بھیجے جو پیسوں

کے عوض جسم بیچنے میں تامّل نہ کرتی ہو۔ لیکن اتنا شرمیلا لڑکا اس معرکے کو زندگی بھر نہیں سر کر سکتا تھا۔ اکثر نتیجہ وہی رہا۔ شب بیداری ۔ تنگ آ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے۔ یعنی تم اپنی مدد خود کر لیا کرو۔ ہفتے میں زیادہ سے زیادہ ایک دفعہ کرو ۔ اور احساسِ جرم کے ساتھ نہ کرو۔ اگر تم نے یہ سمجھا کہ تم کوئی غلط کام کر رہے ہو تو پھر اس کا اثر صحت پر پڑے گا۔"

مجھے معلوم نہیں کہ اس لڑکے کو نیند آنے لگی یا نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت شریف بہت ذہین اور غیر معمولی صلاحیتوں کا لڑکا ہے۔"

مارگریٹ کو یہ واقعہ سُن کر انتہائی تعجب ہوا۔ ساتھ ساتھ تشویش بھی۔ اس نے زندگی کو اس پہلو سے نہ تو کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ شاید اسی لیے وہ کوئی مشورہ بھی نہ دے سکی۔ وہ کہنے لگی "میں خود ایک طالب علم کو جانتی ہوں جس کا پرابلم ہے "ایک گھنٹہ" اس میں تعجب کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تمنا صرف یہ ہے کہ دن ۲۴ گھنٹے کی جگہ ۲۵ گھنٹے کا ہونے لگے۔

وہ صبح چھ بجے روزی کمانے کے لیے نکل جاتا ہے۔ شام کو وہیں سے اپنے کالج چلا جاتا ہے۔ رات کے گیارہ بجے کمرے پر واپس آتا ہے۔ کھانا کھاتے کھاتے بارہ بج جاتے ہیں۔ اور اگر وہ صبح پانچ بجے سو کر نہ اٹھے تو وقت مقررہ پر اپنے کام پر نہیں پہنچ پاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوتی۔

اور اگر ایک مدت تک نیند پوری نہ ہو تو پھر اس کا جو اثر دل و دماغ پر پڑتا ہے اس سے تم واقف ہو۔"

خالد نے بیچ میں دخل دیا۔ "مارگ تم جانتی ہو یہاں ہر شخص پریشان ہے۔ یہ سماج ایک پھٹی ہوئی جیب کی طرح ہے جس میں تم پیسہ ڈالتی چلی جاؤ گرتا چلا جائے گا۔ تم یا میں یا آنند ان دکھوں کا کوئی علاج نہیں کر سکتے۔ اگر تمھارے بس میں ہو تو یہ پھٹی ہوئی جیب سی ڈالو۔"

مارگریٹ کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ایشیائی لوگوں کے گروپ میں بہت دن رہی ہے۔ اُسے اِن لوگوں کے مزاج اور موڈ اور دکھتی رگوں کا خوب اندازہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایشیائی طالب علموں کی اکثریت اس لیے پریشان رہتی ہے کہ ان میں اعتماد کی کمی ہوتی ہے۔ حسرتیں امنگیں اور آرزوئیں ہیں لیکن ہمت نہیں ہے۔ وہ کہنے لگی "خالد اِن ایشیائی لڑکوں میں چاہے وہ ہندوستان کے ہوں یا پاکستان کے ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی ہے کہ یہ خود سے کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن ان کو کوئی ڈھکیلنے والا ہو یا ہمت افزائی کرنے والا ہو تو یہ دوسروں سے زیادہ کر گزرتے ہیں۔ یہ لڑکے اتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی کسی لڑکے کو پکڑ کر زبردستی منہ چوم لے تو اُس کے عشق میں مرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میں تو یورپین، لڑکیوں کو مشورہ دوں گی کہ جس لڑکی کی شادی نہ ہو سکتی ہو اُسے ہندوستان چلا جانا چاہیے۔"

خالد مارگریٹ سے متفق نہیں تھا۔ کہنے لگا — "غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ معصوم لڑکیاں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ مارگریٹ تمہارا خیال غلط ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے یہاں سن بلوغ بہت دیر میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کا منہ چوم لینے پر خاندان کی کئی سو برس کی عزت بھی چلی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم یہاں آتے ہیں۔ سوڈے کی بند بوتل کی طرح۔ تم لوگ اس کی کاگ اڑا دیتے ہو۔ شروع میں یہ بوتل خوب اچھلتی ہے۔ مچلتی اور بلبلاتی ہے فوں فاں کرتی ہے۔ لیکن جلد ہی نارمل بھی ہو جاتی ہے"۔

مارگریٹ اس وقت اس خالد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جو اُسے ڈانس ہال میں ملا تھا۔ شرمیلا جذباتی اور اناڑی۔ لیکن آج وہی خالد اس موضوع پر کتنے اعتماد سے بول رہا تھا۔ سوڈے کی بوتل فوں فاں بند کر چکی تھی۔

دونوں بڑی دیر تک ایسے ہی مسائل پر غور کرتے رہے۔ لوگوں کے دکھ کوئی کہاں تک بانٹ سکتا ہے۔ اپنے غم کو بھول کر دوسروں کے غم میں کھو جانے والے لوگ واقعی کے اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ خالد اور مارگریٹ دیر رات تک انہیں الجھنوں میں پھنسے رہے۔

جب وہ بار تیزان کیفے سے نکلے تو انتہائی سکون محسوس ہوا۔ باہر ٹھنڈک تھی خاموشی تھی اور برف سے ڈھکی ہوئی کالی عمارتیں سنگ مرمر کی معلوم ہو رہی تھیں۔ اکا دکا گزرنے والوں

کے سرپھوئیدار اور شانے برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ساری فضا پر انجماد، برگمین کی فلموں کی وحشت، ویرانی اور تجسس کا ملا جلا سحر پھیلا ہوا تھا۔ اور خاموشی کچھ اس طرح طاری تھی، جیسے لوگ ادھورا کام چھوڑ کر کہیں گئے ہوں، اور اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ یا پھر جیسے کسی بہت بڑی فیکٹری میں دو پہر کے کھانے کی گھنٹی بج چکی ہو۔

سڑکوں پر بھی آج گہری برف جمی ہوئی تھی اور اس برف پر لوگوں کے قدموں کے گہرے نشان آہستہ آہستہ مٹنے شروع ہو گئے تھے۔ مارگریٹ ان نشانوں سے بچتی ہوئی اپنے قدموں کے الگ نشان بناتی ہوئی اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگی۔

خالد سے رخصت ہوتے وقت اس نے صرف ایک بات کہی۔ خالد تم مجھے اس طالب علم سے ملاؤ جس کو نیند نہ آنے کی شکایت ہے۔ شاید میں اس کے کچھ کام آسکوں!!

دوسرا گال

وقت زخموں پہ مرہم رکھتا رہا۔ اور زخم بغاوت پر تُلے رہے۔ کبھی اچھے ہو جاتے کبھی رسنے لگتے۔ کھڑکی کے سامنے لگے ہوئے درخت پر جانے کتنے موسم آئے اور بکل گئے۔ ان دنوں اس پر عریانی کا دورہ پڑا تھا۔ سڑک کے کنارے وہ اس طرح سینہ تانے کھڑا تھا جیسے عیب پوشی کے خلاف اس نے اعلان جنگ کر دیا ہو۔

خالد اس ننگے درخت کی شاخوں کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔ ان کی لمبائی ان کی موٹائی، ان کے خم، ان کے دائرے، ان کے تکون سب کے سب اتنے دلکش تھے کہ خالد تھوڑی دیر کے لیے ان میں کھو گیا۔ پھر یہ درخت آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونا شروع ہو گیا۔ اب اس کی جگہ ایک خوبصورت سڈول نازک جسم تھا۔ اس کا لوچ، اس کا خم، اس کے زاویے ــ ساٹن کی طرح چکنا پھسلتا ہوا جسم ــ یہی سب کچھ تو باربرا کے پاس بھی تھا۔

زخم پھر ہرے ہونے لگے۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے ایک کتاب کے نیچے سے دو کارڈ نکالے۔ ان میں

ایک کرسمس کارڈ تھا اور دوسرا Valentines Day پر بھیجا ہوا گمنام محبت نامہ۔

دونوں کارڈ اس نے میز پر سجا دیئے۔ ٹہلنے کی رفتار ذہن کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی چلی گئی۔ خالد نے دونوں کارڈ اٹھائے۔ ان کو احتیاط سے برابر کیا۔ اور پھر پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالتے ہوئے کہنے لگا "زندگی کے اس باب کو بند ہو جانا چاہیے۔"

اپنے خیالات میں وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ دروازے کی مسلسل دستک ضائع ہوتی رہی۔ پھر کسی نے آہستہ سے دروازہ کھولا "ارے تم اندر بیٹھے ہو۔ میں دس منٹ سے دروازہ پیٹ رہا ہوں۔" جان کسی قدر تعجب سے بولا۔ "خالد منہ لٹکا کر زندگی گزارنے سے اچھا ہے کہ آدمی محبت سے توبہ کر لے۔"

"محبت کو ترک کیے ایک زمانہ ہو گیا ہے جان۔ یہ دیکھو ابھی ابھی میں نے آخری نشانی ردی کی ٹوکری کی نذر کی ہے۔ میری زندگی کا یہ باب اب کبھی نہیں کھلے گا۔"

بڈھا جان مسکرایا "کارڈ پھاڑ کر محبت ختم کر دی۔ کمال کر دیا۔ جیسے قمیض گندی ہو جاتی ہے تو اتار کر پھینک دیتے ہیں۔ اتنا آسان کام تھا تو پہلے کیوں نہیں کیا؟"

جان نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر جیسے اپنے سے باتیں کرنے لگا۔ "یہ کام کاش اتنا ہی آسان ہوتا۔ تو آج میری زندگی کتنی سکھی ہوتی۔"

"جان میں تم سے سو دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اس تکلیف دہ

ذکر کو مت چھیڑا کرو۔ زخموں کو کریدنے میں تمھیں کیا سکون ملتا ہے؟" ہم دونوں دکھی ہو جاتے ہیں۔ جان ایک وعدہ کرو گے"

"ہاں کروں گا"

"وعدہ کرو کہ اب اس ذکر کو کبھی نہیں چھیڑو گے"

جان تھوڑی دیر تک خالد کے چہرے پر نظریں جمائے رہا پھر بولا "بات کرنے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ وقت ہر چیز کا علاج ہے یہ غلط ہے، خالد بالکل غلط ہے۔ وقت جو ہے نا..... وہ دہکتی کو سہ آتشہ بنا دیتا ہے۔ زخموں کو ناسور بنا دیتا ہے اور یادوں کو ـــ یادوں کے زہر کو متھ کر دل کے اندر اتار دیتا ہے۔ میں نے یہ سب زہر پیے ہیں اور اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم وہ غلطی نہ کرو جو میں نے کی ہے"

"جان تم جذباتی ہوتے جا رہے ہو" خالد بولا

"ہاں جذباتی میں کبھی کبھی ہو جاتا ہوں۔ اس لیے کہ میں حساس آدمی ہوں۔ لیکن آج جذباتی ہونے کا خاص سبب ہے"

"کیا سبب ہے؟" خالد کو شبہ ہوا۔

"گزشتہ دنوں میں باربرا سے ملتا رہا ہوں" اور یہ کہہ کر جان خالد کے چہرے کو تکنے لگا۔

لیکن خالد نے اسے زیادہ موقع نہیں دیا۔ حالانکہ جان کی بات چونکا دینے والی ضرور تھی۔ "جان مجھے باربرا کا حال معلوم کرنے کی بالکل خواہش نہیں ہے۔ اس لیے اس موضوع پر بات

کرنے کی تمھیں ضرورت نہیں ہے۔"
جان جو ابھی تک خالد کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کہنے لگا "اُس دن آنند کی پارٹی میں اچانک اس کی طبیعت خراب ہونے کی خبر ٹھیک خبر تھی۔"
"لیکن پھر آندرے کی باہوں میں اسے سکون مل جانے کی خبر شاید تم نے نہیں سنی تھی۔" خالد نے جل کر کہا۔
"آندرے اس کے بچپن کا ساتھی ہے۔ اور باربرا اُسے بھائی کی طرح سمجھتی ہے۔"
خالد سے اب برداشت نہ ہو سکا "ایسے بھائی بہن جو سینے سے سینے لگا کر رقص کرتے ہیں۔ ایسے بھائی بہن کہ اگر حالات ساز گار رہیں تو راتیں بھی ساتھ گزار لیتے ہیں۔"
جان بہت سنجیدہ تھا "لیکن میں جو بات کہنے جا رہا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ باربرا ماں بننے والی ہے۔"
خالد پر ایک لمحے کے لیے سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ اس کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر وہ بھول گیا کہ جان بھی اس کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ "آندرے تم کتنے کمینے ہو۔ تم نے دو معصوم زندگیاں تباہ کر دی ہیں۔ تم نے باربرا کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ اگر میں اس کو لانا بھی چاہوں تو نہیں لا سکتا ـــــ اور آندرے تم موت کے مستحق ہو۔ میں تمھارا گلا دبا سکتا ہوں آندرے۔"
پھر خالد کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور وہ چیخا "میں تمھارا گلا دبا دوں گا آندرے۔"

جان نے آہستہ سے خالد کو پکڑ کر بٹھا دیا۔ پھر کہنے لگا کہ نفرت کا اعلان اتنی جلدی نہیں کر دینا چاہیے، تم کو صحیح حالات نہیں معلوم ہیں اس لیے تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

خالد "صحیح حالات یہ ہیں کہ اس دن پارٹی سے جانے کے بعد آندرے نے تم کو دو دفعہ فون کرنے کی کوشش کی ۔ اور دونوں دفعہ کسی نے جان بوجھ کر ٹیلی فون کاٹ دیا۔ اگر تم نے وہ ٹیلی فون سن لیا ہوتا تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی۔"

خالد "مجھے یاد ہے اس دن دو دفعہ بے وقت گھنٹی بجی تھی۔"

جان "یہ خود آندرے کہتا ہے۔ باربرا کہتی ہے۔"

خالد "یہ سب چالیں ہیں جان۔ فریب ہے — یہ اس حرامزادی مونا نے ٹیپ دیا ہوگا۔ اور پھر باربرا کے ذہین دماغ نے کہانی تیار کی ہوگی ۔

جان "تم باربرا سے اس طرح نفرت نہیں کرسکتے ہو خالد۔ میں تم کو نفرت نہیں کرنے دوں گا۔ تم اس کی زندگی کو تباہ نہیں کرو گے خالد۔

خالد "آوارگی کا بیج پیٹ میں لے کر گھومنے والی کو تباہ کون کر سکتا ہے۔"

جان "خالد یہ تمہارا بچہ ہے۔"

خالد نے ایک زہریلا شیطانی قہقہہ لگایا جو کمرے میں بڑی دیر تک گونجتا رہا "جان پچھلے کئی ہفتوں سے میں بالکل ہی

بات سوچ رہا تھا۔ لیکن میرا دل کہتا تھا "نہیں باربرا اتنی کمینی نہیں ہو سکتی۔" جان، دل جھوٹ نہیں بولا کرتا لیکن اس دن۔۔۔۔۔ میرا دل جھوٹ بول رہا تھا۔ باربرا ایک گری ہوئی چالباز عورت نکلی۔"

جان نے خالد کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اچھے لوگوں کے دل سچ بولا کرتے ہیں۔ تمہارے دل نے جو بات کہی تھی خالد وہ ٹھیک بات تھی۔ باربرا خراب لڑکی نہیں ہے۔ مجھے اس کے کیریکٹر پر پورا بھروسا ہے۔"

خالد کہنے لگا "جان میں جب لندن آیا تھا تو ایک دن آنند نے مجھے اپنے دوست رمیش کا قصہ سنایا تھا۔"

جان سنجیدگی سے کہنے لگا "لیکن بات اب قصوں کی حدود سے باہر نکل چکی ہے۔"

خالد نے جان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی "تو وہ قصہ یہ تھا کہ رمیش کی گرل فرینڈ ہفتے میں دو دن اس سے ملنے آیا کرتی تھی اور باقی پانچ دن وہ اپنی ماں کے ساتھ گزارتی تھی ——— ——— پھر ایک دن پتا چلا کہ لڑکی حاملہ ہو گئی ہے۔ رمیش چونکہ لڑکی کو بہت چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی غلطی کو نبھانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن بعد میں راز کھلا کہ لڑکی کی ماں کو مرے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ رمیش کے دل میں ایک سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ لڑکی ہفتے میں پانچ دن کہاں گزارتی تھی؟ اور سوال کا جواب جب تلاش کیا گیا تو پتا چلا کہ پانچ راتیں گزارنے والے

دوستوں میں بچے پالنے کی ذمہ داری لینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔"

بڑھا جان سکون سے بولا " اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا شمار بھی ان ہی پانچ راتیں کام آنے والے اور وقت پر دھوکا دینے والے دوستوں میں کیا جائے "۔

خالد کو جان کی بات اچھی نہیں لگی ۔ وہ کہنے لگا "جان تم مجھے دھوکا دینے والوں کی فہرست میں رکھتے ہو ؟ آج تم نے میرے کیریکٹر پر شبہ کیا ہے جان "۔

"میں نے تمہارے کیریکٹر پر شبہ نہیں کیا ہے ۔ میں تو صرف یہ سمجھانے آیا ہوں کہ باربرا کا کیریکٹر وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو "۔

" باربرا کی وکالت کرنے والے تم کون ہوتے ہو — میں جانتا ہوں کہ اس کے ناپاک جسم میں پلنے والی اولاد میری نہیں ہے ۔ اور آندرے کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے میں ہرگز ہرگز تیار نہیں ہوں "۔

بڑھا جان غصے کو ضبط کرتے ہوئے تحمل سے کہنے لگا ۔

"خالد اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے ۔ جس دن سے باربرا تم سے الگ ہوئی ہے ۔ میں اس سے ملتا رہا ہوں ۔ اور آج جب وہ اس لائق نہیں ہے کہ اپنے گھر جا سکے ۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ اس کو سہارا دینے والا کوئی نہیں ہے ۔

اور یہی وقت ہوتا ہے جب لڑکی کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے"
خالد کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جان اس کو چاروں طرف سے گھیر کر یہ تسلیم کروانا چاہتا ہے کہ باربرا خالد نے لڑکے کو پال رہی ہے۔ بڈھے جان سے اسے ایسی توقع کبھی نہ تھی۔ اب خالد میں نفرت کا جذبہ جاگ چکا تھا اور نفرت کا یہ لاوا باربرا کی طرف سے ہٹ کر بڈھے جان کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"جان میں کتنی دفعہ تم سے کہہ چکا ہوں کہ باربرا نے مجھے اپنے نت نئے جنسی تجربوں کی خاطر چھوڑا تھا۔ بعض عورتیں ہوتی ہیں جن کو کہیں تسکین نہیں ملتی۔ اور تم ایک ایسی ہی عورت سے ساز باز کر کے میرے پاس آئے ہو۔ تم کان کھول کر سُن لو جان میں کسی آوارہ بازاری عورت کا ہاتھ پکڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں"
بڈھے جان کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "آوارہ اور بازاری عورت کون ہوتی ہے یہ تم کو معلوم ہے؟ اور تمھیں اتنی غیر مہذب اور گندی زبان میں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے"
خالد اپنی پوری طاقت سے چلّایا "ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک آوارہ عورت کو تم زندگی بھر کے لیے میرے گلے ڈالنا چاہتے ہو۔ ایک عام بازاری عورت، جو ہر رات کسی نئے بستر کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور پھر جب اس کے حمل ٹھہر جاتا ہے تو کسی سیدھے سادے عاشق کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے کہ یہ بچہ تمھارا بچہ ہے۔

سڑک کی آوارہ کتیا کا نام تم نے کبھی سنا ہے جان؟"

ایک بھرپور تھپڑ کی آواز ابھری۔ جان کا بھاری بھرکم ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اور خان کے گال پر چار انگلیوں کے نشان ابھر آئے تھے۔

"تمہارا باپ اگر یہاں ہوتا تو شاید وہ تمہارے دوسرے گال پر اس سے زیادہ زور سے تھپڑ مارتا۔"

جان دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اتوار کی صبح تھی ۔ ایک ٹیکسی باربرا کے گھر کے سامنے رکی
باربرا نے کرسی سے اٹھ کر دیکھا تو جان کا مغموم چہرہ نظر آیا۔
وہ اپنا سوٹ کیس لیے دروازے پر کھڑا تھا ۔ باربرا اس کو
دیکھ کر مسکرائی ، لیکن جان کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ کا دور
دور پتا نہ تھا ۔ اس کی سنجیدگی کا مطلب باربرا کے لیے بہت
واضح تھا ۔ باربرا نے جان کے سوٹ کیس پر نظر ڈالتے ہوئے
کہا " جان ، لڑکی جب حاملہ ہوتی ہے تو اسے شوہر سے زیادہ
اپنے باپ کی ضرورت ہوتی ہے "

جان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ باربرا کی بات کا کیا جواب دے
وہ بڑھا " باربرا کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ اور
پھر بڑبڑایا " وہ بڑا اچھا لڑکا ہے ۔ بہک گیا ہے " پھر کرسی پر
بیٹھ کر جانے کیا سوچنے لگا ۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں چھلکنے
لگیں ، اور پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔ وہ منہ پھیر کر اٹھا " کتنی
گرمی ہے لاؤ کھڑکی کھول دیں "

لیکن باربرا نے جان کی چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ لی تھیں ،
کہنے لگی " تم بالکل پاگل ہو ۔ اتنی فکر مت کرو ۔ میں اپنے مسائل
حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں ۔ اور اب میرا خیال ہے کہ
مجھے وہاں جانا چاہیے "

جان ایک دم بولا "نہیں باربرا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو چرچ جانا چاہیے — آؤ جلدی کرو"!

جان نے بوربیٹ سر پر رکھا۔ چھڑی ہاتھ میں لے کر اپنی کہنی باربرا کی طرف بڑھا دی۔ وہ ایک لمحے رُکی۔ اس نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ اور پھر اپنا ہاتھ جان کے بازو میں پہنا دیا۔

دور چرچ کے گھنٹے بج رہے تھے۔ اور باربرا کے بھاری قدم خود بخود آواز کی سمت پر اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔

کالا بچّہ

خالد اب ایک ایسی الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جس سے باہر نکلنے کے لیے ایک پوری زندگی کا تجربہ درکار ہوتا ہے۔ آمد کے باربرا اور جان نے مل کر ایک ایسی مثلث بنا دی تھی جس کے اندر وہ گھستا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن پر خوف اور وحشت کی ایک مستقل کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اٹھتا — ٹیلیفون کی گھنٹی سے اُسے ڈر لگنے لگا۔ اور اس کے تحت الشعور میں ایک کیڑا بلبلا رہا تھا۔ "کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ کوئی بُری خبر ملنے والی ہے، کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے"

لیکن تیزی سے گزرتے وقت نے تکلیف کی شدت کم کر دی اور پھر زندگی آہستہ آہستہ اپنے نارمل راستے پر آ گئی۔

جب کمرے میں خالد کا دم گھٹنے لگا تو اس نے کھڑکی کھول دی لیکن تازی ہوا کا ایک جھونکا اندر نہ آیا "کیا اس منحوس کمرے میں اب ہوا بھی نہ آئے گی" وہ دروازہ کھول کر سڑک پر نکل گیا۔

سڑک لمبی تھی۔ لیکن گلیاں۔ درخت کی شاخوں کی طرح جگہ بے جگہ پھوٹ کر نکل آئی تھیں۔ وہ چلتا رہا۔ لمبے لمبے

قدم اٹھاتے ہوئے۔ سڑک کی گہما گہمی سے بے نیاز بے مقصد چلتا رہا۔

"خالد ۔ خالد" کسی نے زور سے پکارا۔

خالد نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آنند بھاگتا ہوا چلا آرہا تھا۔

"ہلو آنند ۔ کیا حال ہے" خالد نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ سڑک تم کو کہیں نہیں لے جائے گی ۔ اپنی منزل تو تمھیں خود تعین کرنا ہوگا۔" آنند نے لمبی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

"کوئی بیس منٹ سے میں تمھیں پکڑنے کی کوشش میں پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں ۔ جا کہاں رہے ہو ۔ ؟" آنند نے سوال کیا ۔

"میں کہیں نہیں جا رہا ہوں ۔" خالد بولا

"میں ایک بہت بری خبر سنانے کے لیے تمھارے گھر گیا تھا۔ لیکن تم وہاں ملے نہیں ۔ تمھاری لینڈ لیڈی نے بتایا کہ تم ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلے ہو۔"

خالد تو جانے کب سے کسی حادثے کا منتظر تھا۔ وہ ایک دم سناٹے میں آگیا ۔

"بات یہ ہے کہ جان مرنے سے پہلے ایک دفعہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

خالد کے ذہن میں ایک ساتھ جانے کتنی بہت سی تصویریں

ابھریں اور پھر ڈوب گئیں۔

"جان کون سے ہسپتال میں ہے!" اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

"تم میرے ساتھ آؤ"۔ آنند نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور کو پتا بتلاتے ہوئے دونوں اس میں بیٹھ گئے ۔۔۔ دونوں خاموش تھے۔ خالد اس وقت صرف جان کے بارے میں سوچ رہا تھا ہیلن کی موت۔ کارنیشن کے سُرخ پھول۔ اور کرشن سے عقیدت اور پھر آہستہ آہستہ اس کے گال پر چار انگلیوں کے سُرخ نشان جل رہے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا "ڈرائیور اگر تیز چلاؤ گے تو دس شلنگ زیادہ ملیں گے"۔

گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رفتار کی تیزی نے سڑک کے معمولی معمولی موڑ بھی مخدوش بنا دیئے۔ ڈرائیور نے اچانک بریک لگایا اور ایک جھٹکے سے، دونوں مسافر اگلی سیٹ سے ٹکرا گئے۔ آنند نے منہ سے پائپ نکالا اور ڈرائیور سے کہنے لگا "اگر آہستہ چلاؤ گے تو دس شلنگ زیادہ ملیں گے"۔ ڈرائیور نے ہنستے ہوئے گاڑی آہستہ کر دی۔ ہیمپ سٹڈ ہیتھ کے ایک چوراہے پر گاڑی گھومی۔ ڈرائیور نے سر نکال کر مکانوں کے نمبر دیکھے۔ ٹیکسی تھوڑی دور تک رینگتی رہی پھر نمبر دس کے سامنے بریک لگا کر ڈرائیور نے گاڑی کا گیئر نیوٹرل میں ڈال دیا۔

آنند ٹیکسی سے اتر کر اندر بھاگا۔ خالد سہما سہما اس کے پیچھے تھا۔ دو کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ خلاف معمول دھوپ چمک رہی تھی۔ اور بڈھا جان، بہت اداس اور پریشان ایک آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے سو رہا تھا۔

خالد اس کے پاس جاکر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ بڈھے جان کی آنکھیں بدستور بند رہیں۔ آنند نے آہستہ سے جان کو پکارا۔ جان نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خالد سامنے کھڑا تھا۔ پہلے تو اس کو یقین نہ آیا۔ آنکھیں مل کر اس نے شبہ دور کرنے کی کوشش کی۔ اور جب جان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ تو اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں اور اس کے چہرے پر جیتا جاگتا رنگ دوڑ گیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا "خالد تم۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"جان تمھاری طبیعت کیسی ہے؟" خالد نے گھبرا کر پوچھا۔

"میری طبیعت۔ ابھی سو سال اور جیوں گا"

"لیکن۔ لیکن آنند کہہ رہا تھا"

"کہ جان مرنے سے پہلے ایک دفعہ تم سے ملنا چاہتا ہے" آنند نے خالد کا جملہ پورا کر دیا "میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا تم پوچھ لو جان سے وہ واقعی مرنے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا تھا"

"تو میری بیماری کی خبر سن کر تم بھاگے چلے آئے۔ کیا تم ابھی تک میرا اتنا خیال کرتے ہو۔ میں تو سمجھا تھا — خیر چھوڑو — اب تم آ ہی گئے ہو اور پھر معلوم نہیں کہ آئندہ ملنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے۔ میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اس دن میں نے تم پر ہاتھ اٹھا دیا۔ خالد مجھے معاف کر دو۔ بڈھا آدمی ہوں غصہ آجاتا ہے"

خالد اپنے گال کو سہلاتے ہوئے کہنے لگا "اب تو یہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ لیکن یہ دوسرا گال حاضر ہے"

"نہیں اب یہ غلطی کبھی نہیں ہوگی"

"جان میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں ۔"
خالد ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اندرونی کمرے سے کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز ابھری ۔ اور جان اپنی کرسی سے اچھل کر کمرے کی طرف بھاگا ۔

خالد ابھی تک جان کے گھر کا جائزہ نہیں لے پایا تھا۔"یہاں کون رہتا ہے ۔کیا واقعی یہ گھر جان کا ہے ؟" اتنے میں جان ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ بچہ اب خاموش تھا ۔ اس کے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ۔ اس کے ننھے منے ہاتھوں کی مٹھیاں کسی ہوئی تھیں ۔ اور اس کی مسکراتی ہوئی گول گول آنکھوں میں دو موتی ابھی تک جھلک رہے تھے ۔
خالد ٹکٹکی باندھ کر لڑکے کو گھورنے لگا ۔"سانولا رنگ" وہ ابھی تک رنگ ہی میں کھویا ہوا تھا کہ جان بچے کو گود میں سمیٹے ہوئے خالد کی طرف بڑھا ۔ اور کہنے لگا " ہلو کرو ڈیڈی کو "بچے نے اپنا ننا سا ہاتھ خالد کی طرف کر دیا ۔

اب خالد کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی ۔ اس کے سارے شبہات ختم ہو چکے تھے ۔ اس کا اپنا خون ، اس کی اپنی شخصیت اس کے اپنے وجود کا ایک حصہ اپنا ہی لخت اس کے سامنے تھا ۔ اس نے لپک کر بچے کو جان کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ پھر اس کے سارے چہرے کو ڈھیر سارے پیاروں سے ڈھک دیا ۔ اس کے ہونٹ ، اس کی آنکھیں ۔ اس کی ناک ، اس کی ٹھوڑی ، اس کے کالے بال سب کچھ خالد کا تھا ۔ یہ تو اس کی

اپنی تصویر تھی۔ بچپن کی تصویر۔ یہ اس کا اپنا خون تھا۔
پھر کچھ اس طرح سے بچّے کو لپٹایا کہ خالد کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ محبت کے شکنجے میں پھنس کر لڑکے نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔
جان نے بڑھ کر خالد کے ہاتھوں سے بچّے کو لے لیا۔ "اس کو اپنے دادا سے زیادہ پیار ہے۔" جان رو رہا تھا اور اس کے آنسو ٹپ ٹپ کر کے بچّے پر گر رہے تھے۔ اور بچّہ بڈھے دادا کو روتے دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا تھا۔
خالد جذبات سے مغلوب ہو کر جان سے لپٹ گیا۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "باربرا کہاں ہے۔" وہ بے تحاشا دوسرے کمرے کی طرف بھاگا۔
دوسرے کمرے میں جین ایپرن باندھے، سفید تام چینی کا بڑا سا پیالہ لیے راستے میں مل گئی۔ اس نے خالد کو روکنے کی کوشش کی، لیکن خالد اُسے ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔
ایک زرد پتے کی طرح باربرا اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ خالد کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن جین نے اُسے اٹھنے نہ دیا۔ خالد تھوڑی دیر تک، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر آہستہ سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر، اس کے گالوں پر اپنے گال رکھ دیے۔ گرم گرم آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ باربرا اُس کو پیار کرتی رہی۔ اور بیچ بیچ کہتی جاتی "میں جانتی تھی۔ میں جانتی تھی خالد تم آؤ گے۔ میں جانتی تھی خالد کہ تم

ضرور میرے پاس لوٹ آؤ گے۔"

خالد کی آنکھوں سے اُبلتا ہوا چشمہ ایک لمحے کو نہ رکا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا "باربرا مجھے معاف کر دو۔ میں بہت ذلیل آدمی ہوں گھٹیا۔ کمینہ اور بزدل آدمی ہوں۔ باربرا میں نے تم کو کتنے بہت سے دکھ دیے ہیں۔ باربرا میں ان کا کفارہ کیسے ادا کر سکوں گا۔"

"خالد تم سے الگ ہو کر ڈیڈی کا سہارا نہ ملتا تو شاید میں مر چکی ہوتی۔"

"ڈیڈی کہاں ہیں تمھارے، میں ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ ارے جین تم یہاں ہمارے بیڈ روم میں میاں بیوی کی پرائیویٹ باتیں کیوں سن رہی ہو۔ نکلو باہر۔ فوراً نکلو۔"

جین خالد کی بات سن کر مسکرائی۔ جانے کے لیے مڑی تھی کہ باربرا نے اُسے آہستہ سے پکارا "ڈارلنگ ذرا ڈیڈی سے کہہ دو، ہیلن انہیں بلا رہی ہے۔"

"تو۔ تو کیا جان تمھارے ڈیڈی ہیں؟"

"وہ مجھے ہیلن کہتے ہیں اور میں انہیں ڈیڈی" باربرا مسکرائی۔

"تو جان سے کہہ دو جین، کہ کرشن انہیں بلا رہا ہے۔ اور اگر وہ فوراً نہیں آئیں گے تو ہم لوگ خفا ہو جائیں گے۔"

جان تو پہلے ہی دروازے پر کھڑا ہوا یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "نہیں بیٹے۔ اب میں کرشن اور ہیلن کو کبھی نہیں خفا کر سکتا۔"

باربرا کہنے لگی "خالد تم جانتے ہو تم نے ہم دونوں کو مذہبی بنا دیا ہے"

"وہ کیسے ڈارلنگ" خالد نے تعجب سے پوچھا۔
"ہم دونوں۔ یعنی میں اور ڈیڈی، روز رات کو عبادت کرتے اور ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ جاتے تھے۔ اور خالد ہیں ہم نے خدا کو دھمکی دی تھی"
"خدا کو دھمکی دی تھی"
"ہاں ہاں ہم نے اس سے کہا تھا" ہم لوگوں کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ہم سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔ اور اب اگر تو نے ہماری نہ سنی تو پھر ہم تجھ کو بھی چھوڑ دیں گے"
خالد کہنے لگا "دھمکیوں سے اوپر والا ڈر جاتا ہے۔ اس نے ضرور سن لی ہوگی"
ہاں ڈارلنگ اس نے میری اور جان کی دعا سن لی نہیں تو میں شاید خودکشی کر لیتی۔۔۔"
"اسے کیا دعا مانگی تم لوگوں نے" خالد نے پیار سے سوال کیا۔۔۔

"میں نے اس سے کالا بچہ مانگا تھا خالد"
خالد نے آہستہ سے جھک کر باربرا کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا تو جان اور